گدھے کی واپسی
کرشن چندر

(ناول)

نام کتاب : گدھے کی واپسی
مصنف : کرشن چندر
کتابت : محمد عارف سہسوانی
سن اشاعت : ۱۹۹۶ء
مطبوعہ : فوٹو آفسیٹ پرنٹرس دہلی
قیمت : ۷۵/- روپے

پبلیشرز
ایشیا پبلیشرز
اے ۳۹۔ چیتک اپارٹ مینٹس
پلاٹ نمبر ۲/۲۷ ۔ سیکٹر ۹
روہنی ۔ دہلی ۸۵

کرشن چندر

M/s Asia Publishers
A-36 Chetak Appt.,
Plot No:27/2
Sector 9 Rohini,
Delhi-85
T.NO:7261823

GHADHE KI VAPASI
Krishan Chander
Price- Rs.75/-

ناظرین باتمکین ! میں نہ روسیوں کا راکٹ ہوں، نہ امریکیوں کا راکٹ ہوں، نہ گلی جش خاں کا پھاٹک ہوں۔ نہ میں رمتا جوگی نیارا ہوں۔ نہ کوئی مصنوعی سیارہ ہوں، نہ کسی فلم ہیروئن کا پیارا ہوں۔ نہ کسی لکھ پتی کی آنکھ کا تارا ہوں۔ میں محض ایک گدھا آوارہ ہوں۔ جسے بچپن کی غلط کاریوں کے باعث جار بینی کی عادت پڑ گئی تھی جو نہ کویراج گرنام داس کے ہدایت نامہ سے دُور ہوئی، نہ پیاری بہن جی کے علاج سے گئی۔ اخبار پڑھتے پڑھتے میں انسانوں کی بولیاں بولنے لگا۔ اور حکمت و سیاست کے راز کھولنے لگا۔ اسی کے لیے میں نے اپنا پیارا وطن بارہ بنکی چھوڑا۔ اور ڈنکی بن کر دلّی کے ایک دھوبی سے ناطہ جوڑا۔ دھوبی کو اچانک ایک مگرمچھ نے کھا لیا۔ اور مجھے دھوبی کی بیوہ اور اس کے یتیم بچّوں کے گزارے کے لیے افسروں کے حضور میں عرضی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ وہ عرضی لے کر میں دفتر دفتر گھوما اور منسٹر منسٹر پہنچا اور پہنچتے پہنچتے ایک دن سیدھا پنڈت نہرو کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔

پنڈت نہرو سے اتفاقیہ طور پر میرا جو انٹرویو ہو گیا، اس نے مجھے آسمان شہرت کے بام پر پہنچا دیا۔ لوگ مجھے گھروں اور کلبوں میں بلانے لگے۔ گلیوں اور بازاروں میں میرا جلوس نکالنے لگے۔ ایک سیٹھ نے سمجھا میں کوئی خدائی فوجدار ہوں۔ یا کوئی کروڑ پتی ٹھیکیدار ہوں۔ جس نے اوپر سے ایک

معصوم گدھے کا بھیس دھارا ہے۔ اور اندر ہی اندر کوئی بہت بڑا ٹھیکہ مارا ہے۔ وہ بعد منت و سماجت مجھے اپنے گھر لے گیا، اپنی فرم کا حصہ دار بنانے لگا، اور اپنی حسین لڑکی سے میری شادی رچانے لگا۔ اور ہائی سوسائٹی میں گھمانے لگا۔ میں نے بہت انکار کیا، اصرار کیا، بتایا میں یوں تو علم و دانش سے لدا ہوں۔ مگر دراصل ایک گدھا ہوں۔ مگر وہ لالچ کا اندھا میری پوری بات سننے سے پہلے اَن سُنی کر دیتا تھا اور اپنی ہی ہانکے جاتا تھا، اور برابر میری خاطر کیے جاتا تھا۔

چند ماہ تو بڑے عیش و آرام میں کٹے مگر جس دن اس لالچی سیٹھ کو پتہ چلا کہ میرے پاس کوئی پرمٹ ہے نہ کوٹا، اسی دن وہ بے پیندے کا لوٹا، مجھے مارنے پر تُل گیا اور کمرہ بند کر کے اس نے اور اس کی لڑکی نے مار مار کر میرا بھرکس نکال دیا۔ اور مجھے سخت زخمی کر کے باہر سڑک پر ڈال دیا۔

چھ ماہ تک میں جانوروں کے ہسپتال میں پڑا زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا رہا۔ درد کی شدت سے کراہتا رہا انسانوں کی بے حسی اور گدھوں کی بے بسی پر روتا رہا۔ مگر قدرت کو میرا جینا منظور تھا اور میرے لیے زندگی کا زہر پینا مقدور تھا اس لیے میں اچھا ہو گیا۔

صحت یاب ہوتے ہی ہسپتال کے نیک دل ڈاکٹر نے مجھے اپنے آفس میں بلایا اور میری پیٹھ پر دو سیر گھاس لاد کر کہا۔ "تمھارے لیے یہ دو سیر گھاس کافی ہے۔ باقی اللہ شافی ہے۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ، اور میرا دو ہزار کا بل چکاتے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! میں ایک پڑھا لکھا گدھا ہوں اس لیے مفلس اور آوارہ ہوں۔ میں جب تک جیوں گا تمھاری جان و مال کو دعائیں دوں گا۔ مگر اس بل کو ادا نہیں کر سکتا۔" ڈاکٹر کہ جس کا نام رام اوتار تھا اور جو اپنے کام میں بڑا ہوشیار تھا، میری مجبوری سمجھ کر مسکرا دیا، اور بل کو واپس اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔

"تو میرا یہ قرض تم پر باقی رہا۔ اب اگر واقعی تم یہ قرض ادا کرنا چاہتے ہو تو سیدھے بمبئی چلے جاؤ۔"

"بمبئی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" ڈاکٹر بولا۔ "مغربی ہندوستان میں ایک شہر آباد ہے جو سب شہروں کا استاد ہے۔ اس کا نام بمبئی ہے۔ تم سیدھے وہاں چلے جاؤ اور کام کر کے میرا قرض چکاؤ۔"

میں خود دہلی میں نہ رہنا چاہتا تھا۔ دہلی جس نے میری شہرت کا عروج دیکھا، اور جو اب میری

ذلّت کی پستیاں دیکھ رہی تھی، اب مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس لیے میں نے ڈاکٹر کی صلاح مان لی۔ اور بمبئی جانے کی ٹھان لی۔

دہلی سے میں ریل کی پٹری کے کنارے کنارے ہو لیا اور متھرا پہنچا کیوں کہ مجھے متھرا کے پیڑے کھانے کا بہت شوق تھا۔ مگر متھرا میں مجھے پیڑوں کی بجائے پنڈوں کے ڈنڈے کھانے کو ملے اور میں وہاں سے جان بچا کر سیدھا گوالیار پہنچ گیا۔ مقصد یہ تھا کہ تان سین کے مزار پر جاؤں اور اس عظیم موسیقار کے سامنے اپنا سیس نواؤں جس کے نام سے ہندوستان میں کلاسیکل موسیقی کا بھرم قایم ہے اور یہ تو سب لوگ جانتے ہیں کہ آج کل ہندوستان میں صرف دو طرح کے لوگ کلاسیکل موسیقی پسند کرتے ہیں۔ ایک تان سین کے معتقد۔ دوسرے گدھے۔ ورنہ ساری دنیا ریڈیو سیلون سنتی ہے۔

تان سین کے مزار پر بڑا سناٹا تھا۔ ایک کونے میں دو مجاور پڑے اونگھ رہے تھے۔ فرش پر باسی ہاروں کی پتیاں بکھری پڑی تھیں۔ ذرا فاصلے پر چند بھیڑ بکریاں فلمی پلے بیک گانے والیوں کی طرح منمنا رہی تھیں۔ آفتابِ موسیقی کے مزار کی یہ حالت دیکھ کر میرے دل کو بڑا دکھ ہوا اور میں نے وہیں چار زانو ہو کر مرحوم استاد کی خدمت میں زانوئے ادب تہہ کیا، اور پھر سر اٹھا کر شدھ جھنجھوٹی میں ایک ایسی زوردار تان لگائی جس نے جھنجھوڑ کر خوابِ خرگوش میں سوئے ہوئے مجاوروں کو جگا دیا۔ وہ جاگ کر حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے اور بجائے اس کے کہ لوگ میرے ذوقِ سلیم بلکہ ذوقِ اکبر کی داد دیتے جس کے سہارے میں نے استاد مرحوم کی روح کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی، وہ پیجنے چھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے۔ اور مجھے ڈنڈے مار مار کر انھوں نے وہاں سے بھی بھگا دیا۔

میں ڈنڈے کھا کر اس قدر بے مزہ نہ ہوا تھا جتنا یہ سوچ کر بے مزہ ہوا کہ اب اس ملک میں آرٹ اور کلچر کا خدا ہی حافظ ہے، جہاں ایک پکّے گانے والا دوسرے پکّے گانے والے کو خراجِ عقیدت بھی ادا نہیں کر سکتا!

لہٰذا میں نے زور کی دولتی جھاڑی اور راستے میں خلیج دیکھی نہ کھاڑی سیدھا بمبئی آ کے دم لیا۔ یہاں گھیسو گھسیارے نے مجھ پر کرم کیا۔ اور مجھے تھان پہ باندھ لیا۔

گھیسو گھسیارا تھا بڑا بے چارہ، کیوں کہ اس کے بچے تھے گیارہ۔ وہ گھاس کا ایک گٹھا اپنے سر پر لادتا تھا اور چار میری پیٹھ پر۔ اور روز پہنچ جاتا تھا جوگیشوری میں دودھ بیچنے والے گوالوں کے پاس، جو اس کی گھاس کے گٹھے خرید لیتے تھے اور اسے اس کی رقم دے دیتے تھے۔ جسے لے کر وہ سیدھا جوزف ڈی سوزا کی جھونپڑی میں جاتا تھا۔ اور جاتے ہی ایک پوا ٹھرے کا چڑھا جاتا تھا۔ اور اپنے دوست رمضانی قصائی اور کرنیل سنگھ ٹیکسی ڈرائیور سے گپ لڑاتا تھا۔

میں جھونپڑے کے باہر ناریل کے پیڑوں کے نیچے ہری ہری گھاس چرتا تھا اور شکر کرتا تھا کہ آخر مجھے عافیت کی زندگی ملی۔

بمبئی میں آکر میں نے انسانوں کی بولی ترک کر دی تھی، کیوں کہ تجربے نے مجھ پر ثابت کر دیا تھا کہ ان انسانوں کی دُنیا میں وہی لوگ خوش رہ سکتے ہیں جو گدھے بن کر رہیں۔ عقل مند کا یہاں گزارہ نہیں کیوں کہ نیک مشورہ کسی کو پیارا نہیں! اس لیے میں انسانوں کی بولی سے حذر کرنے لگا اور ایک جانور کی زندگی بسر کرنے لگا، جیسے بمبئی میں وہ سب لوگ بسر کرتے ہیں، جن کے لیے پیسہ ہی محبوب ہے اور جنھیں صرف اپنا عیش و آرام مرغوب ہے۔

چھ ماہ کے عرصے میں، میں ہری ہری گھاس کھا کر خوب موٹا ہو گیا میری کالی کھال چکنی ہو گئی۔ میری ایال پر صحت کا رنگ چمکنے لگا۔ اور میں ایک خوبصورت گدھا بن گیا، جس پر کوئی بھی گدھی عاشق ہو سکتی تھی، اور یہ تو صنفِ نازک کی کمزوری ہے کہ وہ ہمیشہ خوب صُورت گدھوں پر عاشق ہوتی ہے، چکنی کھال پر اس کی جان جاتی ہے، چاہے اُس کے اندر بھُس ہی بھرا ہو۔

ادھر کچھ عرصے سے چند گدھیوں نے مجھ پر ڈورے ڈالنے شروع کیے تھے۔ مگر ان میں سے جو سب سے زیادہ نرم و نازک اور شیریں اداؤں والی تھی وہ میری طرف مطلق التفات نہ کرتی تھی۔ اس لیے میرا دل بار بار اس کی جانب کھنچا چلا جاتا تھا اور ایک عجیب و غریب کشش میرے دل میں اس کے لیے محسوس ہوتی تھی۔ اس کے کان لانبے، پتلے، مخروطی اور سنہرے بالوں والے تھے اور جس طرح وہ اپنے چھوٹے سفید دانتوں سے ہری ہری دُوب چگتی تھی اس پر میرا دل لوٹ لوٹ جاتا تھا۔ وہ دوسری بھوکی چٹوری گدھیوں

کی طرح گھاس پر پل نہیں پڑتی تھی، بلکہ جس ادا سے وہ ایک لقمہ کھا کر الگ ہو جاتی تھی اور بڑی گھاس کو شونگھ کر بیزاری سے چھوڑ دیتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی نہایت اعلیٰ اور امیر و کبیر خاندان کی گدھی ہے جو محض تفریح کی خاطر گدھوں کے اس غول میں جوزف ڈی سوزا کی جھونپڑی کے باہر ناریل کے پیڑوں کے نیچے چرنے کے لیے چلی آئی ہے۔ بھوک امیروں کے لیے ایک عمدہ تفریح ہے۔ غریبوں کے لیے ایک شدید ضرورت ہے۔

ایک روز موقع پاکر میں اس کے قریب چلا گیا۔ وہ ناریل کے ایک جھنڈ کے نیچے اکیلی گھاس چر رہی تھی اور عجب شانِ بے اعتنائی سے دُم ہلا رہی تھی کہ میں نے اس کے قریب جاکر آہستہ سے کہا۔

"اے پری جمال، خوش خصال، کب تک ہم سے نظریں چراؤ گی؟ ذرا ادھر تو دیکھو اپنے عاشق کی طرف۔"

"ہشت" وہ اپنے نتھنے پھُلا کر بڑی نخوت سے ہنہنائی۔

"آخر ایسی بھی کیا بیزاری؟ میں بھی ایک گدھا ہوں" میں نے کہا۔

"عشق میں ہر شخص گدھا ہو جاتا ہے" اس نے مجھ سے ایسے کنٹیلے لہجے میں کہا کہ میں ایک لمحے کے لیے چپ ہو گیا۔ واقعی بے حد حاضر جواب گدھی تھی۔ معلوم ہوتا نہایت اعلیٰ تربیت پائی ہے۔ میں نے سوچا اگر اس سے میری شادی ہو جائے تو زندگی سنور جائے، ورنہ عام گدھوں کی ایسی گدھیوں سے شادی ہوتی ہے جنھیں گھاس چرنے اور بچے جننے کے سوا اور کوئی کام نہیں آتا۔ مگر یہ تو بڑی عاقل و فرزانہ معلوم ہوتی ہے۔ قدرت نے اسے حسن کے علاوہ اعلیٰ ذوق بھی عطا کیا ہے۔ ارے اس کے ساتھ تو پکچر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ذرا سوچو تو ہمارے بچے کتنے ذہین ہوں گے۔ بالکل گدھے تو نہ ہوں گے۔

میں نے اس کی طرف گردن بڑھا کر کہا۔

"ڈارلنگ"

اس نے ایسی زور کی دولتی جھاڑی کہ اگر میں فوراً ہی اپنی گردن نہ موڑ لیتا تو شاید میری آنکھ ہی پھوٹ جاتی۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے نتھنوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ شعلہ بار

نگاہوں سے مجھے تاکتی ہوئی بولی۔

"ایک گھسیارے کے گدھے ہوکر مجھ سے عشق کرتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی؟"

میں نے گھبرا کر کہا۔"تم کون ہو؟"

وہ بولی۔"میں وکٹر برگانزا کی گدھی ہوں، جو جوزف ڈی سوزا کا باس ہے، اور دس بھٹیوں کا مالک ہے۔ گورے گاؤں سے دادر تک اُس کا ٹھرّا بکتا ہے اور میں تمھاری طرح گھاس نہیں لاتی ہوں۔ شراب کے صرف چار پیپے گورے گاؤں سے لاد کر یہاں جوگیشوری میں جوزف ڈی سوزا کے جھونپڑے تک پہنچا دیتی ہوں، پھر شام کو خالی پیپے واپس لے کر جاتی ہوں۔ تمھاری طرح دن بھر گدھوں کی طرح محنت نہیں کرتی ہوں"

"کیا بات ہے بیٹی!" یکایک قریب سے ایک آواز آئی۔ اور میں نے دیکھا کہ ایک پختہ عمر کی مگر اعلیٰ قسم کی گدھی نوجوان گدھی کے قریب آگئی ہے۔

"کچھ نہیں اماں" نوجوان گدھی نے کہا "یہ گدھا مجھ سے عشق کرنے چلا ہے۔ ذرا سنو تو اس کی بات"

پختہ عمر کی گدھی نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولی "تم کون ہو؟"

میں نے اپنا تعارف کرایا۔

"وہ سُن کر بولی "تمھارا ہمارا کیا میل؟ تم ہندو، ہم عیسائی! کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"یوپی کا"

"تم یوپی کے ہم مہاراشٹر کے۔ تمھارا ہمارا کیا جوڑ؟"

"کون جات ہو؟"

"گدھوں کی بھی ذات ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"واہ کیوں نہیں ہوتی؟۔ جو مالک کی جات ہوتی ہے۔ وہی اس کے غلام کی جات ہوتی ہے۔ وہی انسان کا دھرم ہوتا ہے۔ ہم جانور لوگ تو اپنے مالک کے رتبے سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہم وہی سوچتے اور کرتے ہیں جو انسان کرتا ہے"

"حالاں کہ میں نے تو اکثر انسانوں کو جانوروں کی طرح سوچتے اور کرتے دیکھا ہے بڑی بی"

میں نے عاجزی سے کہا۔

بڑی بی کو میری بات پسند آئی، بولی۔

"تم سمجھدار گدھے معلوم ہوتے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ، اگر میں اپنی بچی کی شادی کرنے پر تم سے تیار ہو جاؤں تو تم میری بچی کو کہاں رکھو گے؟ اور کیا کھلاؤ گے؟"

"رکھنے کے لیے کوئی خاص جگہ تو نہیں ہے گھیسو گھسیارے کے ہاں۔ وہ مجھے رات کو گھر کے باہر جامن کے پیڑ سے باندھ دیتا ہے۔ بلکہ اکثر اوقات مجھے کھلا ہی چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ میں اِدھر اُدھر گھاس چر کر اپنا پیٹ بھر لوں۔"

"تو وہ تمھیں گھاس نہیں ڈالتا ہے کیا؟"

"نہیں۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ میری بچی کی اگر تمھارے سنگ شادی ہو جائے تو اسے بھی گھاس نہیں ملے گی۔"

"عشق میں گھاس کا کیا گزر؟ اقبال نے کہا ہے، بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق! عشق، بڑی بی! عشق تو عشق ہے۔ اور گھاس گھاس ہے۔ مجھے دیکھو۔ عشق بھی کرتا ہوں اور گھاس بھی کھاتا ہوں۔ اور کبھی کبھی جب گھاس نہیں ملتی تو صرف عشق کھاتا ہوں! قوالی گاتا ہوں۔ یہ عشق عشق ہے۔ عشق عشق! بڑی بی تم میرے حوالے کر دو اپنی بیٹی کو۔ گھاس کا کیا ہے، یہ دُنیا بڑی وسیع ہے۔ کہیں نہ کہیں گھاس مل ہی جائے گی۔"

"جی نہیں۔" بڑی بی سختی سے بولیں۔ "میں اپنی معصوم بچی کی تم سے ہرگز ہرگز شادی نہ کروں گی۔ جس کے نہ باپ کا پتہ نہ ماں کا۔ نہ دھرم ٹھیک نہ جات درست۔ جس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں۔ رہنے کے لیے کوئی تھان نہیں، کھانے کے لیے گھاس نہیں! اوپر سے پڑھے لکھے آدمی کی طرح بات کرتے ہو۔"

میں نے فخریہ لہجہ میں کہا۔ "ہاں میں اخبار پڑھ سکتا ہوں۔ مگر اس میں برائی کی کیا بات ہے؟"

"یہ تو بہت بری بات ہے۔" بڑی بی جل کر بولیں۔ "آج کل ہندوستان میں جتنے پڑھے

لکھے گدھے ہیں سب کلرکی کرتے ہیں۔ یا فاقہ کرتے ہیں۔ تم ہی بتاؤ تم نے آج تک کسی پڑھے لکھے معقول آدمی کو لکھ پتی ہوتے دیکھا ہے؟ نا بھیا! میں تو اپنی بیٹی کی کسی لکھ پتی سے شادی کروں گی۔ چاہے وہ بالکل اَن پڑھ گھامڑ گدھا ہی کیوں نہ ہو!"

مجھے اس گدھی کی احمقانہ باتوں پر بڑا غصہ آیا۔ مگر چوں کہ معاملہ عشق کا تھا اس لیے میں زہر کا گھونٹ پیتے ہوئے اسے پھر سے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"دیکھو اماں! آج کل کا نیا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں دھرم، جات پات کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ہم سب ہندوستانی ہیں۔ ہم سب گدھے ہیں۔ بس اتنا ہی سوچ لینا کافی ہے۔ یہ سوال قومی وحدت اور ایکتا کا ہے۔"

"امیر اور غریب میں قومی اخوت کیسی۔ تمھارے مسائل الگ، ہمارے مسائل الگ۔ تمھارے مفاد الگ، ہمارے مفاد الگ۔ تمھارا معیار زندگی الگ ہمارا معیار زندگی الگ۔ اور پھر ہم تو ہندوستانی بھی نہیں! ہماری تو نسل بھی تم سے الگ ہے۔ میری بچی کے دادا، خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے خالص انگریزی گدھے تھے۔ اور میری ماں فرانسیسی نسل کی تھیں، اور تم ٹھہرے ایک آوارہ، بے کار، کالے ہندوستانی گدھے۔ اور چلے ہو میری بیٹی سے عشق جتانے۔ خبردار جو میری بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا! دونوں آنکھیں پھوڑ ڈالوں گی!"

یہ کہہ کر بڑی بی نے میری طرف پیٹھ کرکے اتنے زور کی دولتی جھاڑی کہ میں گھبرا کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور سیدھے ڈی سوزا کی جھونپڑی کے سامنے آکے دم لیا اور اس دن سے عہد کرلیا کہ اب کبھی عشق نہیں کروں گا۔ کیوں کہ عشق کرنے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ آدمی شاعرانہ طبیعت رکھتا ہو، عشق کرنے کے لیے یہ بھی اشد ضروری ہے کہ آدمی کو دو وقت کی گھاس میسّر ہو۔ ورنہ کوئی عورت گھاس نہیں ڈالے گی۔

اس لیے میں نے اس پری پیکر گدھی سے عشق کرنے کا ارادہ ترک کردیا، اور اپنی زندگی کو صرف گھاس لادنے کے لیے وقف کردیا، کہ جو ہر گدھے کا مقدر ہے!

کھل جانا آرے کالونی کا بمبئی میں
اور بھوکے مرنا جوگیشوری کے گوالوں کا
گھیسو گھسیارے کا بیچ دینا اپنے گدھے کو
اور بیان نئی مصیبتوں کا ....

دن بڑے آرام سے گزر رہے تھے۔ گھاس لادنا۔ گھاس کھانا، اور اپنے کھونٹے پہ جا کے سو جانا۔ زندگی اس سے سادہ اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور اس دنیا میں بیشتر لوگ اس سے زیادہ اور چاہتے بھی کیا ہیں؟ مگر اس فلکِ کج رفتار کو کیا کہیے کہ میرے چند دنوں کا یہ سکون بھی اسے گوارا نہ ہوا۔

اوّل افتاد یہ پڑی کہ گورنمنٹ کے رفاہِ عام کی خاطر بمبئی میں خالص دودھ سپلائی کے لیے ایک بہت ڈیری آرے کالونی کے نام سے چالو کر دی۔ تمام مصیبتیں اسی طرح نیک ارادوں سے شروع ہوتی ہیں اب بھلا بمبئی میں خالص دودھ کی کسے ضرورت تھی؟ بمبئی کے بہادر باشندوں نے جنگِ آزادی کی ساری لڑائی ایرانیوں کی چائے اور گوالوں کا آدھا دودھ اور آدھا پانی پی کر لڑی، جیتی اور زندہ رہے۔ انھیں خالص دودھ مہیا کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ ان کے ذہن کو خواہ مخواہ مزید جدوجہد اور لڑائی کے لیے اکسایا جائے۔ غالباً سرکار کا مقصد یہ نہ ہوگا مگر ہوتا یہی ہے۔ ایک ضرورت کو پورا کر دینے سے دوسری ضرورتوں کی بھوک بڑھ جاتی ہے، اور جاننے والے جانتے ہیں

کہ جس دن سے آرے کالونی کی بنیاد پڑی اس دن سے سمیکت مہاراشٹر کا قصہ بھی شروع ہوگیا۔ آخر آپ لوگوں کو خالص دودھ پلاکر ان سے اور کیا توقع رکھ سکتے ہیں؟ یہ ایرانیوں کی چائے ہی تھی جو مہاراشٹر اور گجرات میں تال میل پیدا کیے ہوئے تھی۔ ورنہ دودھ تو ہمیشہ تقسیم کرتا ہے۔ پنجاب والوں کو ہی لے لیجیے۔ دودھ پینے کے عادی تھے۔ اسی لیے تقسیم ہوگئے۔ قصور دودھ کا تھا اور الزام دھرا جاتا ہے بے چارے انگریزوں پر۔ حالاں کہ صاحب دودھ میں ایسی قوت ہے کہ اگر آپ کچھ نہ کریں، اسے چند گھنٹوں کے لیے کسی برتن میں اکیلا چھوڑ دیں خود بخود تقسیم ہو جائے گا۔ دودھ کا دودھ الگ، پانی کا پانی الگ۔ انسانی تاریخ میں اس طرح کی بظاہر چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے دور رس نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر سوچیے کہ اگر محمد بن قاسم نے ہندوستان کی بجائے چین پر حملہ کیا ہوتا تو آج پاکستان چین میں ہوتا۔ اگر نپولین پانی پت میں پیدا ہوا ہوتا تو واٹر لو کی لڑائی میں انگریزوں کی جیت کبھی نہ ہوتی۔ اگر کولمبو کی کشتی سمندر میں ڈوب جاتی تو امریکہ کبھی دریافت نہ ہوتا اور بے چارہ کولمبس زبان حال سے غالب کا یہ مصرعہ دُہراتا۔ "ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟" اسی قسم کے استدلال سے ٹائین بی نے اپنی پوری تاریخ مرتب کی ہے۔ اسی لیے میں بھی کہتا ہوں کہ اگر آرے کالونی نہ بنتی تو مہاراشٹر کا صوبہ بھی نہ بنتا۔ یہ صرف دودھ کا قصور ہے۔ دودھ جو تقسیم کرتا ہے۔

بمبئی کے شریف لوگ تقریباً ایک سو سال سے ایرانیوں کی پھیکی سیٹھی چائے پیتے چلے آرہے تھے۔ اب انھیں جو خالص دودھ پینے کو ملا تو ان کا ہاضمہ ایک دم بگڑ گیا اور جب عوام کا ہاضمہ بگڑتا ہے تو وہ طرح طرح کی مانگ کرنے لگتے ہیں "ہمیں مہاراشٹر چاہیے" "ہمیں کام چاہیے" "ہمیں روٹی چاہیے" "ہمیں مکان چاہیے" "چھاتا چاہیے" "سینما چاہیے" "تعلیم چاہیے" اور ہر شے اتنی ہی سستی اور عمدہ چاہیے جتنا کہ آرے کالونی کا دودھ ہے۔"

اسی لیے پرانے زمانے میں جو لوگ حکومت کرتے تھے وہ عوام کی کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتے تھے۔ اس سے عوام کا ہاضمہ بالکل درست رہتا تھا مگر اب تو وہ اس

قدر بگڑ چکا ہے کہ کسی خوشنما وعدے کے چورن سے ٹھیک نہیں ہو سکتا۔

آرے کالونی کے بن جانے سے جہاں ایک طرف گوالوں کی گاہکی بھی کم ہوگئی اور سینکڑوں گوالے بے کار ہو گئے۔ انھوں نے اپنی گاہکی کو قایم رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔ کبھی دودھ کا بھاؤ کم کیا اور گھسیارے کو زیادہ دبایا۔ کبھی پانی کی تعداد کم کی اور نقصان زیادہ اٹھایا، مگر آرے کالونی کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ آرے کالونی کا دودھ زیادہ مقبول ہوتا گیا اور پرائیویٹ تجارت کرنے والے گوالے اپنے اونچے منافع سے ہاتھ دھونے لگے۔ اگر وہ بالکل خالص دودھ بیچتے اور آرے کالونی سے ذرا کم دام پر بیچتے تو اب بھی وہ تھوڑا سا منافع کما سکتے تھے۔ مگر یہ تو تجارت کے اصول کے خلاف ہے اور ہمارے نظامِ زندگی میں اس وقت تک تجارت نہیں ہو سکتی جب تک کسی ایک چیز میں کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ کی جائے۔ مثلاً دودھ میں پانی، ادب میں عریانی، آٹے میں برادہ، نفرت پر مذہب کا لبادہ، گھی میں تیل، حکومت میں رشوت کا میل۔ یہ تو تجارت کا پہلا اصول ہے۔

تجارت کا دوسرا اصول یہ ہے کہ اس آمیزش میں بھی بلند و پست کا توازن برقرار رکھا جائے۔ مثال کے طور پر اگر آپ نے دودھ میں شہد ملا دیا تو تجارت ہو چکی۔ ایک اعلیٰ چیز کے ساتھ کسی دوسری اعلیٰ پائے کی چیز کو نہیں ملایا جا سکتا۔ تجارت کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ ایک اعلیٰ معیار کی شے کے ساتھ ایک معمولی، کم حیثیت، سستی شے کو (اگر نقصان دہ بھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں) ملا دیا جائے۔ آج کل کی تجارت کا تمام کمال و فن اسی میں ہے۔ مثال کے طور پر پانی کی اپنی جگہ پر کیا قیمت ہے؟ میرے ایسے گدھے تک اسے مُفت پی لیتے ہیں۔ لیکن جب یہی پانی دودھ میں ملتا ہے تو اپنے سے چوگنی قیمت پاتا ہے۔ لکڑی کے بُرادے کی اپنی جگہ کیا حیثیت ہے؟ لیکن یہی برادہ جب آٹے میں ملتا ہے تو دسترخوان کی زینت بن جاتا ہے۔ نفرت اپنی جگہ کتنا گھٹیا جذبہ ہے لیکن جب مذہب کی سان پر چڑھ جاتا ہے تو لاکھوں بے گناہوں کی جان لے لیتا ہے۔ تجارت کے اسی گُر سے نہ صرف دودھ کے دوکان دار بلکہ مذہب کے تاجدار، سیاست کے ساہوکار بھی واقف ہیں۔

جب گوالوں کا دودھ بکنا بند ہو گیا تو گھیسو گھسیارے کی گھاس بکنی بند ہو گئی۔ گھر میں گھیسو گھسیارے
اور اس کے بیوی بچوں کو فاقے لگنا شروع ہوئے صورت اس درجہ نازک ہو گئی کہ ایک روز
جوزف ڈی سوزا کی جھونپڑی میں گھیسو گھسیارے نے مجھے بیچنے کی سوچ لی۔ یہ ترکیب اسے
رمضانی قصائی نے سمجھائی تھی۔ بات یوں چلی کہ گھیسو گھسیارا جب سے بے کار رہا تھا زیادہ
پینے لگا تھا اور اودھار پینے لگا تھا۔ پہلے تو جوزف اُدھار پر ٹھرا پلاتا رہا مگر جب اُدھار
حد سے بڑھ گیا اور گھیسو کی آمدنی کی کوئی صورت دکھائی نہ دی تو اس نے ہاتھ کھینچنا شروع کر دیا۔
وہ بلا شبہ گھیسو کا دوست تھا مگر ایک دوست بھی کہاں تک کسی کو مفت پلا سکتا ہے؟
اس موقعے پر رمضانی قصائی نے گھیسو کو مشورہ دیا۔ میں جھونپڑی کے باہر کھڑا سن رہا
تھا۔ کہنے لگا۔

"اگر تم اس گدھے کو میرے ہاتھ بیچ دو تو میں تمھیں اس کے پچیس روپے
دے دوں گا۔"

جوزف بولا۔

"ہاں ٹھیک تو کہتا ہے رمضانی۔ آج کل تمھاری گھاس کہیں نہیں بک رہی ہے
اس لیے تم اس گدھے کو رکھ کر کیا کرو گے؟ پھر سات روپے میرے بھی باقی ہیں تم پر۔ وہ
بھی اس رقم میں سے کٹ جائیں گے۔"

کرنیل سنگھ بولا۔

"اور باقی رقم پر تم دس دن بلا ناغہ مزے سے پی سکتے ہو۔ آگے دیکھا جائے گا۔"

گھیسو بولا۔

اس بے چارے گدھے کا کوئی خرچ تو ہے نہیں مجھ پر۔ خود ہی دن میں اِدھر اُدھر
سے گھاس چر کے میرے گھر کے باہر آ کے پڑ رہتا ہے۔ دن بھر میرے بچے اس کی
سواری کرتے ہیں، اور ایک آدھ گھاس کا گٹھا تو اب بھی بک ہی جاتا ہے۔"

رمضانی بولا۔

"وہ ایک آدھ گھاس کا گٹھا تم خود اپنے سر پر لاد کے بیچ سکتے ہو۔ تم خود سوچ

لو، پورے پچیس روپے دوں گا۔ اور وہ بھی دوستی میں دے رہا ہوں۔ ورنہ یہ گدھا تو پندرہ روپے میں بھی مہنگا ہے۔"

گھیسو نے پوچھا۔

"تم اس گدھے کو لے کر کیا کرو گے؟"

رمضانی ایک آہ بھر کر بولا۔"

"اس دنیا میں جینا بہت مشکل ہو چلا ہے۔ آج کل بھیڑ بکریاں ایسی دبلی پتلی آ رہی ہیں کہ ایک بکری کے اندر سے تین سیر گوشت بھی مشکل سے نکلتا ہے۔ اب یہ تمھارا گدھا خاصا اچھا کاٹھی اور موٹا تازہ ہو رہا ہے۔ اس کا گوشت نہایت ہی عمدہ نکلے گا۔"

"تو تم گدھے کا گوشت بیچو گے؟" گھیسو نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں! مگر بکری کے گوشت میں ملا کے بیچوں گا۔" رمضانی بولا۔

"بکری کے گوشت میں ملا کے بیچو گے؟" گھیسو حیرت سے چلایا۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" رمضانی نے ذرا خفا ہوتے ہوئے کہا۔ "تمھارے گوالے کیا دودھ میں پانی ڈال کے نہیں بیچتے؟"

"مگر گدھے کا گوشت؟" گھیسو نے پھر آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "لوگوں کو پتہ نہیں چلے گا؟"

"یہ تو اپنے اپنے پیشے کی گُر کی بات ہے۔" رمضانی بولا۔ "میں نے ایسے ایسے اُستاد دیکھے ہیں جو بکری کے گوشت میں کتے کا گوشت ملا کے بیچ دیتے ہیں۔ میں تو صرف گدھے کا گوشت بیچوں گا۔ اور پھر قیمے میں تو کچھ پتہ ہی نہیں چلتا ہے۔"

"یہ تو اپنے اپنے پیشے کی بات ہے۔" کرنیل سنگھ ڈرائیور رمضانی کی ران پر تھپکی مار کر بولا۔ "ورنہ ہم لوگ مالک کے پٹرول میں کیا کیا گھپلا کر جاتے ہیں، اور نہ کریں تو زندہ کیسے رہیں؟ اس لیے میرے یار۔"

کرنیل سنگھ نے گھیسو کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب تم دیر نہ کرو۔ ہاں کر دو۔"

میری ٹانگیں خوف سے سن ہو گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے میری

ہر ٹانگ کے ساتھ چار چار من کے وزنی پتھر باندھ دیے ہیں۔ میں چھپر کی دیوار کے ساتھ دروازے کے پیچھے لگا یہ گفتگو سن رہا تھا، جس میں میری زندگی اور موت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ میں یہ سننا چاہتا تھا کہ آخر گھیسو کیا کہتا ہے۔ ایک بے زبان جانور نے اتنے ماہ اس کے لیے دل و جان سے محنت کی تھی۔ اور معاوضے میں گھاس کا ایک تنکا نہ لیا تھا۔ کیا اس انسان کے سینے میں شکر کا ایک رتی بھر جذبہ نہ ہوگا؟۔

گھیسو نے کہا۔

"یہ گدھا مجھ سے اور میرے بچوں سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔ اس کی جان لینے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ تھوڑی سی اور دو یار۔"

"لو پیو۔" رمضانی نے اس کا گلاس بھرتے ہوئے کہا۔ "مگر تم اس کی جان کہاں لے رہے ہو؟ جان لینے والا یار رکھنے والا وہ اوپر والا ہے۔" رمضانی نے کھپریل کی چھت کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ "تم تو گدھے کو خالی میرے ہاتھ پچیس روپے میں فروخت کر رہے ہو۔ اور یہ پچیس بھی میں دے رہا ہوں یار کی یاری کے لیے کسی دوسرے سے بات کرو گے تو دس بھی نہ دے گا۔ رہنے دو۔ نہیں تمہارا جی چاہتا ہے تو نہ سہی۔"

کرنیل سنگھ نے بات پلٹ کر کہا۔ "ابے تو کل کہاں گیا تھا رمضانی یہاں نہیں آیا۔"

"بھیا میں عقیلہ بانو گڑھوالی کی قوالی سننے گیا تھا۔ ظالم کیا گاتی ہے۔

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ہم کو ناز تھا وہ دل نہیں رہا۔"

رمضانی پہلے گنگناتا رہا، پھر زور زور سے گانے لگا۔ گھیسو زور زور سے سر ہلانے لگا۔ اور کرنیل سنگھ ٹین کا ایک خالی ڈبہ بجانے لگا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ چلو زندگی بچ گئی۔ آئی ہوئی موت ٹل گئی۔ گھیسو گھسیارا سرور میں آ کر بولا۔

"پچیس روپے کیا، اگر کوئی پچاس ہزار بھی دے تو بھی میں اپنا گدھا نہ بیچوں گا۔"

"یار کون تیرے گدھے کی بات کرتا ہے؟" جوزف ذرا غصے سے بولا۔ "رمضانی

کا گانا تو سننے دے ۔"

مگر گھیسو گھسیارے کو چڑھ ہو گئی تھی ۔ وہ زور سے اپنا ہاتھ جھلاتے ہوئے بولا ۔

"کوئی پچاس لاکھ بھی دے تو میں اپنا گدھا نہ دوں ۔ اس گدھے نے میری اتنی خدمت کی ہے ، میری اور میرے بچوں کی کہ میں زندگی بھر اسے اپنے پاس رکھوں گا ۔ جب پیار سے کبھی کبھی مجھے دیکھتا ہے تو اس سے مجھے معلوم ہوتا ہے جیسے اس گدھے کی کھال کے نیچے کسی نیک سادھو کی آتما چھپی ہوئی ہے ۔ کوئی پچیس کروڑ بھی دے تو میں یہ گدھا نہ دوں ۔ گھیسو گھسیارے نے آج تک کسی کی بھی جان نہیں لی ۔ یہ ہمارے دھرم شاستر کے خلاف ہے ۔"

"لے آیا پھر بیچ میں اپنا دھرم ۔" کرنیل سنگھ ڈرائیور چڑھ کر بولا ۔ "یار جوزف جلدی سے اس کا گلاس بھر دو ۔"

"کہاں سے بھر دوں ؟" جوزف غصّے سے بولا ۔ "سات روپے کی یہ پہلے ہی پی چکا ہے ۔ کہاں تک ادھار دوں گا ؟"

"بھر دو ! بھر دو ۔" گھیسو زور سے چلایا ۔ "وہ بھگوان دینے والا ہے ۔ کہیں نہ کہیں سے تمھارا قرض بھی اُتار دے گا ۔"

"جب اُتار دے گا تب اور پی لینا ۔" جوزف بولا ۔ "اب میں ایک بوند نہ دوں گا ۔"

گھیسو نے اپنے خالی گلاس کی طرف دیکھ کر رمضانی سے کہا ۔ "میرا گلاس خالی ہے ۔"

"اور خالی رہے گا ۔" جوزف سختی سے بولا ۔

"ایک روپیہ دے ۔" رمضانی سے گھیسو نے کہا ۔

رمضانی نے جیب سے پچیس روپے نکال کے کہا ۔

"ایک نہیں پچیس دیتا ہوں ۔"

گھیسو نے ایک لمحے کے لیے پچیس روپوں کی طرف دیکھا ۔ ایک لمحے کے

لیے رُکا پھر اس کا ہاتھ بے اختیار پچیس روپوں کی جانب بڑھ گیا۔ جلدی سے اس نے روپے جیب میں ڈال کے کہا۔

"چلو گدھا تمھارا ہوا۔ لے بھیا جوزف، اب تو شراب دے دے۔"

رمضانی میرے گلے میں رسّی ڈالے ہوئے مجھے لے جا رہا تھا۔ اور لہک لہک کر گا رہا تھا۔

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

یکایک میں نے کہا۔

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

یکایک رمضانی نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا، میری طرف دیکھا، پھر مجھے رسّی سے کھینچتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ اس کے چہرے پر میں نے خوف کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی۔ اب رات کا جھٹپٹا بڑھ رہا تھا اور اپنے دل کے خوف کو رمضانی زور زور سے گاتے ہوئے مجھے لے جا رہا تھا اور دہرا رہا تھا۔

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

میں نے ذرا بلند آواز میں پھر کہا۔

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

رمضانی خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اُس نے اِدھر اُدھر راستے میں دیکھا مگر کسی کو

موجود نہ پاکر رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں چلا کر کہا۔

"کون بولتا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔

"میں ہوں ایک گدھا"

"تم۔ تم؟" رمضانی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "تم ایک گدھے ہو کر انسانوں کی بولی بولتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں نے عہد کر رکھا تھا کہ انسانوں کی بولی کبھی نہیں بولوں گا۔ لیکن جب جان پر بن آئی ہے اور انسان کی بے وفائی آنکھوں کے سامنے آتی ہے تو غالب کے الفاظ میں کہنا ہی پڑتا ہے۔

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ!" رمضانی نے زور سے کہا اور گھبرا کر اس نے رسّی ہاتھ سے چھوڑ دی۔ پھر میری طرف پیٹھ کرکے اس تیزی سے بھاگا کہ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا اور اسے بلاتا ہی رہ گیا۔ "رمضانی بھیا! ذرا سنو تو۔ اے رمضانی"

مگر اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور خوف سے وحشیانہ طریقہ سے چیختا ہوا کچھ پڑھتا ہوا وہاں سے ہوا ہوگیا۔

میں سر جھکا کر ہولے ہولے قدموں سے واپس چلنے لگا اور چند منٹ کے بعد جوزف ڈی سوزا کے جھونپڑے کے باہر پہنچ گیا۔ مگر گھیسو گھسیارا اس وقت وہاں سے جاچکا تھا اور کرنیل سنگھ بھی۔ اس وقت اکیلا جوزف اپنے جھونپڑے کے باہر لکڑی کے ایک بنچ پر بیٹھا ہوا آخری جام پی رہا تھا۔ اس نے جو مجھے دیکھا تو لپک کر آگے بڑھا اور میری رسّی اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔

"رسّی تڑا کے اپنی جان بچا لائے۔ مگر بچ کے کہاں جاؤ گے میاں گدھے! صبح تم

کو رمضانی کے حوالے کر دوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے ناریل کے ایک پیڑ سے باندھ دیا۔

میں نے موقعہ دیکھ کر جوزف کو آہستہ سے آواز دی۔

"جوزف!"

"ہائیں!" وہ حیرت سے چیخا۔

میں نے کہا۔ "چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ایک پڑھے لکھے آدمی ہو اس لیے میں تم سے گفتگو کرتا ہوں اور تم سے کہتا ہوں کہ یہ میں گدھا ہی بول رہا ہوں۔"

"کیا میں نشے میں ہوں؟" جوزف نے اپنے آپ سے پوچھا۔

"نشے میں تو ہو۔ مگر یہ بالکل سچ ہے کہ اس وقت تمھارا نشہ نہیں بول رہا ہے۔ یہ خاکسار بول رہا ہے۔ بچپن میں، میں نے انسانوں کی بولی سیکھ لی تھی۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی تھوڑی سی بپتا جوزف کو کہہ سنائی۔

وہ میرا حال سن کر بولا۔

"گوڈ گاڈ! بالکل یقین نہیں آتا۔ مگر اب تمھیں اپنے سامنے اپنے کانوں سے بولتا سن رہا ہوں تو یقین کرنا پڑتا ہے کہ تم وہی مشہور و معروف گدھے ہو جس نے پنڈت نہرو سے ملاقات کی تھی۔ اب یاد آرہا ہے۔ میں نے اس کے متعلق اخباروں میں بھی پڑھا ہے۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"میں نے کہا۔" تم رمضانی کے ہاتھوں سے میری جان بچا سکتے ہو؟"

"وہ کس طرح؟" جوزف نے پوچھا۔ "رمضانی نے پچیس روپوں میں تمھیں گھیسو سے خرید لیا ہے۔"

پچیس روپوں میں کیا تم میری جان لے لو گے؟" میں نے پوچھا۔

"بمبئی میں دادا لوگ تو دس روپے میں جان لینے کو تیار رہتے ہیں، اور وہ بھی ایک انسان کی جان۔ تم تو ایک گدھے ہو۔ پڑھے لکھے ضرور ہو۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ جنگ عظیم میں میں ایک سپاہی تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لاکھوں انسانوں کو چند روپوں کی خاطر خون اور آگ کی بھٹی میں جھونک دیا گیا

تھا۔ تم تو محض ایک گدھے ہو۔"

"وہ بھی گدھے تھے۔" میں نے تلخ تر لہجہ میں کہا۔ "اگر حساب لگاؤ تو جنگ کے محاذ پر انسانوں کی زندگی بھیڑ بکریوں سے بھی سستی بکتی ہے۔ ہیروشیما کے بم نے ستر اسی ہزار جانیں لے لیں۔ ذرا حساب لگاؤ۔ فی کس پچیس روپے بھی نہیں پڑیں گے۔"

جوزف بولا۔ "اس حساب سے تمھیں خوش ہونا چاہیے کہ ایک گدھے کی زندگی کی قیمت ایک انسان کی زندگی سے زیادہ پڑ رہی ہے۔"

میں نے اس کی بات اَن سُنی کر کے کہا۔ "ان لوگوں نے بے کار لاکھوں انسانوں کو مشین گنوں سے بھون دیا۔ اگر وہ ان کا گوشت بکری کے گوشت میں ملا کر بیچتے تو انھیں زیادہ منافع ہوتا اور منافع ہی تو وہ چاہتے ہیں۔"

"تم کیسی بھیانک باتیں کرتے ہو۔" جوزف چلایا۔

"اتنی بھیانک نہیں جتنی کہ یہ زندگی ہے جس میں پچیس روپوں کی خاطر ایک کے گلے کی رسّی دوسرے کے ہاتھ میں تھما دی جاتی ہے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" جوزف نے جان چھڑانے کو پوچھا۔

"میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔" میں نے گلوگیر لہجہ میں کہا۔ "میری طرح کے کروڑوں لوگ اس دنیا میں موجود ہیں جو بے حد سادہ لوح ہیں۔ نرے گدھے ہیں، لیکن ہم سب زندہ رہنے کا حق مانگتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی اپنے گلے میں رسّی نہیں چاہتا۔"

"خدائی فوجدار نہ بنو۔" جوزف بولا۔ "صرف اپنی بات کرو۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے رمضانی سے خرید لو۔"

"واہ۔ ایک گدھے کی جان بچانے کے لیے رمضانی کو پچیس روپے دیدوں؟ ایسا گدھا نہیں ہوں۔" جوزف بگڑ کر بولا۔

"تم میری بات پوری سن لینے پر کچھ کہتے۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں تمھارا ہی فائدہ ہے۔ اگر تم مجھے رمضانی سے خرید لوگے تو میں تمھارا تھرّا بغیر تلاشی کے ماہم کریک کی پولیس چوکی کے پار پہنچا دیا کروں گا۔ اب تک تم اس کام کے لیے

انسانوں سے کام لیتے رہے ہو جو کبھی نہ کبھی پولیس کے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں۔ انھیں سزا ہو جاتی ہے اور تمھاری شراب پکڑی جاتی ہے۔ لیکن اگر اس کام کے لیے تم مجھے نوکر رکھ لوگے تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ پولیس ایک بار بھی مجھے نہ پکڑ سکے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"بہت آسان کام ہے۔ مگر اس کے لیے تمھیں اپنا ایک اڈہ باندرے میں اور دوسرا ماہم کریک کے باہر ماہم کے علاقے میں قایم کرنا پڑے گا۔"

جوزف بولا۔ "تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہاں پہلے سے کئی اڈے موجود ہیں ہمارے۔"

میں نے اسے سمجھایا۔

"پھر تو اس تجویز پر عمل کرنا انتہائی آسان ہے اور مجھے حیرت ہے آج تک کسی سمگلر کو ایسی عمدہ تجویز کیوں نہیں سوجھی۔؟"

جوزف نے بے چینی سے کہا۔ "اب تم باتیں نہ کرو۔ جلدی سے اپنی تجویز سمجھاؤ۔"

"تجویز بے حد آسان ہے۔ تم صرف اتنا کرو کہ علی الصبح مجھے جوگیشوری سے باندرہ کے اڈے پر لے جاؤ۔"

"اچھا؟"

"پھر وہاں صبح سویرے نہار منہ میرے خالی معدے کو شراب سے بھر دو۔ حلق تک۔ میرے معدے اور آنتوں میں کئی گیلن شراب سما سکتی ہے۔ اس لیے جب حلق تک شراب بھر جائے تو مجھے ماہم کریک تک لے جاکے چھوڑ دو۔ وہاں سے میں خود آہستہ آہستہ ایک آوارہ، بے مالک گدھے کی طرح چلتا ہوا پانچ منٹ میں پولیس چوکی پار کر جاؤں گا۔ پولیس کو ایک لمحے کے لیے بھی شبہ نہ ہوگا کہ اس گدھے کے پیٹ میں اتنے گیلن شراب بھری ہوئی ہے۔ وہ تو صرف انسانوں کی اور ان کے کپڑوں کی تلاشی لیتے ہیں۔ مگر ایک ننگے گدھے پر جس کے بدن پر کپڑے کا ایک چیتھڑا تک نہیں ہے اس پر انھیں کیسے شبہ ہوگا؟ میں ہر روز پولیس چوکی سے بے خوف و خطر گزر جایا کروں گا۔"

"پھر؟"

"پھر ماہم کے اڈّے پر پہنچ کر تم میرے حلق میں ربڑ کی نالی ڈال کر پمپ کے ذریعے سے شراب نکال لیا کرنا، اور اپنے گاہکوں میں تقسیم کر دیا کرنا۔"

"کیا میرے گاہک ایک گدھے کے پیٹ سے نکلی ہوئی شراب پینا پسند کریں گے؟"
میں نے جواب دیا۔

"احمق ہوئے ہو۔ جو لوگ گندی موریوں میں دبائی ہوئی بوتلوں اور گندے سڑے پیپوں کی شراب پیتے ہیں۔ جو لوگ سائیکل کی گلی اور پرانی ٹیوبوں سے تو ے جانی گئی شراب ڈکار جاتے ہیں، انھیں ایک گدھے کی آنتوں سے نکلی ہوئی شراب پینے میں کیا عذر ہوگا؟ صبح سویرے میرا بھوکا خالی معدہ بہرحال سڑی گلی ٹیوبوں سے تو زیادہ صاف ستھرا ہوگا۔"

"اور تمھیں نشہ نہیں ہوگا کیا؟"

"پانچ منٹ میں کیا نشہ ہوگا؟ ماہم کریک کراس کرنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہ لگیں گے۔ یوں سوچو کہ میرا پیٹ ایک پٹرول لے جانے والی لاری کا بڑا ڈرم ہے باندرہ ایک فلنگ سٹیشن ہے۔ باندرہ پر تم اس ڈرم کو بھر دیتے ہو۔ ماہم پر خالی کرا لیتے ہو بے حد عمدہ، آسان، سستی کارآمد، محفوظ اور سائنٹفک تجویز ہے۔"

"گڈ بلیس یو" جوزف نے ایک منٹ سوچنے کے بعد کہا۔ پھر اس نے خوشی سے دونوں باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ "کیا ترکیب بتائی ہے تم نے! ایک سمگلر گدھا پولیس قیامت تک شبہ نہیں کر سکتی۔ ہولی کرائسٹ میں تو ایک ہی سال میں لکھ پتی ہو سکتا ہوں۔"

فرطِ مسرت سے جوزف میرا مونہہ چومنے لگا۔ "اب تو میں ضرور لکھ پتی بن جاؤنگا اب تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہا۔ اب تو میں پچیس کیا سو روپے رمضانی کو دے کر تمھیں اس سے خرید لوں گا۔"

"وہ اس لیے کہ میں پہلے محض ایک گدھا تھا۔ اور اب میں ایک منافع بخش تجویز ہوں اور جب انسان کو منافع نظر آنے لگے تو وہ ایک گدھے کا مونہہ بھی چوم سکتا ہے۔"

"اندر جاؤ" جوزف نے میری رسّی اپنی لکڑی کے گرد مضبوطی سے باندھتے ہوئے کہا۔

"میں تمھیں باہر ناریل کے پیڑ کے نیچے باندھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ ممکن ہے تمھیں سردی لگ جائے۔ تمھارے بدن پر تو ایک کپڑا بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "دُنیا میں کروڑوں بے گھر گدھے ننگے یا اُدھ ننگے کھُلے آسمان تلے سوتے ہیں۔"

"اجی گولی مارو ان گدھوں۔ میں تو تمھیں آج اپنے چھپّر کے اندر سلاؤں گا۔"

"مگر چھپّر کے اندر تو بڑی گرمی ہوگی۔" میں نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کے لیے چھت کا پنکھا کھول دوں گا، ڈنکی سر۔" جوزف نے بڑی عاجزی سے کہا۔ اور پھر بڑے پیار سے میری گردن سہلاتا ہوا مجھے چھپّر کے اندر لے گیا۔

❖

شروع ہونا سمگلنگ کے دھندے کا
اور پار کر جانا گدھے کا ماہم کریک کو آسانی سے
اور پڑ جانا ہاتھوں میں سیٹھ بھسوڑی مل کے
اور بیان ماہم کے سستے بازوں کا۔

کم بخت جوزف نے رات بھر مجھے بھوکا رکھا۔ صبح بھی گھاس کا ایک تنکا تک توڑنے نہ دیا۔ اور صبح ہی مجھے باندرہ کے خفیہ اڈے پر لے گیا۔ باندرہ تک پہنچتے پہنچتے بھوک سے میں بے حال ہونے لگا۔ آنتیں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں اور میرا پیٹ پچک کر پسلیوں سے جا لگا۔

میری یہ حالت دیکھ کر جوزف بے حد خوش ہوا، کیوں کہ میرا پچکا ہوا پیٹ اس بات کا ثبوت تھا کہ میرا معدہ بالکل خالی ہو چکا ہے۔ مجھے بھی شروع ہی سے اس بات کا خیال تھا کہ اس کام میں مجھے دن میں صرف ایک بار کھانا ملا کرے گا۔ اور وہ بھی صبح دس گیارہ بجے، اپنے کام سے فارغ ہو جانے کے بعد۔ مگر میں نے یہ سوچ کر صبر کر لیا تھا کہ اس دُنیا میں کروڑوں انسان ایسے ہیں جنھیں دن بھر کی محنت کے بعد صرف ایک وقت کی روٹی ملتی ہے۔ میں تو ایک گدھا ہوں۔ مجھے اگر دن بھر کی مشقت کے بعد ایک وقت کی گھاس مل جائے تو کیا بُرا ہے؟۔

باندرہ کے خفیہ اڈّے پر پہنچ کر جوزف نے مجھ سے پُوچھا۔
"اب کیا کریں؟"
میں نے کہا۔ "اب ایک بالٹی بھر کے شراب میرے سامنے رکھ دو۔ میں اسے پی جاؤنگا۔"
جوزف ایک چھپر کے اندر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس چھپر کے اندر سے دو آدمی باہر نکلے۔ ایک جوزف تھا اور دوسرا اس کا دوست کامتا پرساد تھا۔ یہ ایک دُبلا پتلا، دھوتی باندھے ہوئے ٹھگنا تھا۔ اس کی ایک آنکھ کانی تھی، دوسری شفاف نیلی تھی۔ یہ دوسرا آدمی بڑا چارسو بیس اور کائیاں معلوم ہوتا تھا۔ دونوں نے بالٹیاں اٹھا رکھی تھیں۔
پہلے میں نے ایک بالٹی پی، پھر دوسری، پھر کامتا پرساد تیسری اٹھالایا۔ وہ بھی کسی نہ کسی طرح میں نے پی لی۔ اب کامتا پرساد چوتھی بھی اُٹھا لایا۔ میں نے انکار کر دیا۔
"تم کوشش تو کرو" کامتا پرساد نے مجھے بڑھاوا دیتے ہوئے کہا۔ "جتنی شراب تمھارے پیٹ میں جا چکی ہے اتنی شراب تو ایک تگڑا شرابی صبح سے شام تک پی لیتا ہے۔ تم گدھے ہو کر ایک بالٹی اور نہیں پی سکتے؟"
"نہیں" میں نے بیزار ہو کر کہا۔ "میرا پیٹ پھٹ جائے گا"
"خیر، نہ سہی" کامتا پرساد نے مُڑ کر جوزف سے کہا۔ "اسے ہر روز رات کو ایک عمدہ سا جلاب دینا چاہیئے۔ اینوز فروٹ سالٹ! یا کوئی ایسی ہی چیز۔ صبح کو اس کا پیٹ ایسا صاف ہو جائے گا کہ آسانی سے اس میں چوتھی بالٹی کی شراب سما سکے گی"
میں نے کہا۔ "اب مجھے جلدی سے یہاں سے لے چلو۔ ڈر ہے کہیں مجھے نشہ نہ ہو جائے۔ سُنا ہے خالی پیٹ یوں بھی نشہ بہت ہوتا ہے"
ان دونوں نے جلدی سے مجھے باندرہ کی مسجد سے چند قدم آگے لے جا کر چھوڑ دیا۔ اور میں ایک آوارہ گدھے کی طرح جھومتا جھامتا ادھر اُدھر سر مارتا سڑک سونگھتا پولیس چوکی کی طرف بڑھنے لگا۔
صبح کا وقت تھا۔ سمندر سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ کریک کے پانی پر ماہی گیروں کے جال پھیلے ہوئے تھے۔ بادبانی کشتیاں سامان سے لدی ہوئی کُھلے

سمندر میں جارہی تھیں اور چھوٹی چھوٹی لڑکیاں پھول دار فراک پہنے ہوئے چڑیوں کی طرح چہکتی ہوئی سکول جارہی تھیں۔

ایسا خوب صورت منظر تھا کہ میرا دل خوشی سے جھومنے لگا۔ اور جی چاہا کہ شُدھ اساڈی لے میں ایک ایسی تان چھیڑوں جو حلق سے نکل کر سیدھی آسمان کے بادلوں تک پہنچ جائے، بغیر کسی سمگلنگ کے.... مگر فی زمانہ یہ ناممکن ہے۔ تجارت نے ہر شے کو اس قدر گھیر لیا ہے کہ آج کل کوئی معمولی سے معمولی شے بھی بغیر پرمٹ کے، کوٹے کے، سمگلنگ کے، رشوت کے، اِدھر سے اُدھر نہیں کی جا سکتی۔ کلاسیکل موسیقی کو بھی آج کل ریڈیو والے لائٹ میوزک کے پروگرام میں سمگل کر کے پیش کرتے ہیں۔

میں یوں ہی سوچ رہا تھا اور اپنی دھن میں چلا جارہا تھا کہ اتنے میں میری نظر ایک مراٹھی عورت پر پڑی، اور میں اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر وہیں ٹھٹھک کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے گہرے سبز رنگ کی مراٹھی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس کے اودے بلاؤز پر سونے کا منگل سوتر چمک رہا تھا۔ وہ سونے کی چمکتی ہوئی نتھ پہنے ہوئے تھی اور اپنے ایک ہاتھ میں تھالی اُٹھائے ہوئے تھی۔ اس میں روشن دیئے اور پھول رکھے ہوئے مندر کو جارہی تھی۔ اس کے چہرے پر صبح کے گلاب کھلے ہوئے تھے۔ اور اس کی بالوں کی طرح سپید وینی میں سے چمپا کی مہک آرہی تھی۔ وہ اپنی لانبی لانبی پلکیں جھکائے ایسی باحیا مقدس اور شرمیلی معلوم ہورہی تھی.... جیسے وہ اس دنیا کی مخلوق نہ ہو، کسی دور دراز اونچے آسمان کی اپسرا ہو۔ میں تو اسے دیکھتے ہی مبہوت ہوگیا۔ اور ہولے ہولے اس کے پیچھے چلنے لگا۔

پولیس چوکی پر خاصی بھیڑ تھی۔ بہت سی ٹیکسیاں، اور گاڑیاں اور ٹرکیں رُکی ہوئی تھیں۔ پولیس کے سپاہی باری باری ہر ایک گاڑی اور ٹرک کو اندر باہر غور سے دیکھتے، جائزہ لیتے اور پھر اسے آگے بڑھنے کا موقع دیتے۔

اب پولیس والوں نے ایک ٹیکسی کی ڈِکی کھلوالی تھی اور غور سے اس کے سامان کی تلاشی لے رہے تھے۔

وہ خوب صورت عورت پولیس کے سپاہیوں کے قریب جاکر ذرا سی ٹھٹھکی۔ اس نے اپنی تھالی کا توازن اپنے بلند ہاتھ پر ٹھیک کیا اور نظریں جھکائے آگے بڑھنے لگی۔ پولیس والوں نے فوراً پیچھے ہٹ کر اسے راستہ دے دیا۔

اتنے میں پیچھے سے پولیس کی ایک عورت کی آواز آئی۔

"اے کیتھے"

وہ خوب صورت عورت مڑکر دیکھنے لگی۔

پولیس کی عورت نے اس سے کہا۔

"اکڑے ای؟"

وہ خوب صورت حسینہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ پولیس کی عورت اس کے قریب پہنچ کر غور سے اس کے چہرے کو تاک کر کہنے لگی۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"مندر"

پولیس کی عورت نے جلدی سے ایک ہاتھ اس خوب صورت عورت کے گداز کولہے پر مارا۔ مجھے اس عورت کی یہ حرکت بے حد بُری معلوم ہوئی۔ کس قدر بدتمیز عورت ہے یہ پولیس کی؟ میں ابھی یہاں تک ہی سوچ پایا تھا کہ پولیس کی عورت نے دوسرا ہاتھ اس کی پیٹھ پر مارا۔ دوسرے لمحے میں وہ اس کی نوگزی ساڑھی کے اندر سے شراب سے بھری ہوئی ربڑ کی ٹیوب برآمد کر رہی تھیں، جو اس کے پیٹ کے اردگرد بندھی ہوئی تھی۔

"یہ ہے تم تھرا لے کر مندر جاتی ہو" پولیس کی عورت نے طنزاً کہا۔ اور وہ خوبصورت عورت زور زور سے رونے لگی۔

پولیس کے ایک سپاہی نے میری پیٹھ پر ڈنڈا مارتے ہوئے کہا۔

"ابے یہ گدھا یہاں کیا کر رہا ہے؟"

ڈنڈا کھاتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ اور ماہم کے چوک تک دوڑتا چلا گیا، جہاں جوزف اور کامتا پرساد پہلے ہی سے میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ جوزف نے

میرے گلے میں رسّی ڈال دی۔ اور مجھے کھینچ کر ایک تنگ سی گلی میں لے گیا۔ وہاں جا کر انھوں نے مجھے ایک تاریک مکان کے اندر دھکیل دیا۔ یہ پُرانی وضع کا ایک تاریک سا مکان تھا۔ کچھ دیر تک انھوں نے مجھے اس کی تاریک ڈیوڑھی میں کھڑا رکھا۔ پھر کامتا پرساد نے ڈیوڑھی کے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔

"کون ہے؟" اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔

"میں ہوں کامتا پرساد"

دروازہ کھل گیا اور اس میں سے بادامی رنگ کا بلاؤز اور گہرے سُرخ رنگ کا سایہ پہنے ہوئے ایک نوجوان عورت برآمد ہوئی۔ اس کے ہونٹ گہرے سُرخ تھے۔ اور بڑی بڑی آنکھیں گہری سیاہ۔ اس نے مست ادا سے اپنے کولھے مٹکائے اور بولی۔

"خالی ہاتھ آئے ہو؟"

"ماریا! تم دروازہ تو کھولو" جوزف نے بڑی بے چینی سے کہا۔ "اور خود پرے ہٹ جاؤ"

ماریا نے دروازہ پوری طرح سے کھول دیا۔ اور پرے ہٹ گئی۔ وہ دونوں مجھے کھینچ کر اندر لے گئے۔ اندر ایک کشادہ صحن تھا جس کے ایک کونے میں آگ جل رہی تھی۔ ایک کونے میں بہت سے ڈرم پڑے ہوئے تھے۔ اور ایک الگنی پر دُھلے ہوئے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ اور ایک کونے میں ایک کھاٹ پر ایک بڈھا آدمی سو رہا تھا۔

کامتا پرساد ماریا کے ساتھ ایک طرف کے برآمدے میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں ربڑ کی ایک لمبی ٹیوب لے کر باہر آئے۔ پھر ان دونوں نے میرے مونھ کے نیچے ایک بڑا ڈرم رکھ دیا۔ اور میرے معدے میں ٹیوب ڈال شراب باہر نکالنے لگے۔

ماریا نے جو میرے مُنہ سے شراب نکلتے دیکھی تو پہلے حیرت سے اس کی بڑی بڑی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پھر وہ قہقہہ مار کر اتنی ہنسی، اتنی ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جوزف نے ماریا کے کولھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کیا اب بھی تمہیں شبہ ہے ماریا، کہ اب میں بہت امیر ہو جاؤں گا، پھر تو تم مجھ سے شادی کر سکوگی نا؟"

"دیکھیں گے"۔ ماریا نے ہاتھ مار کر جوزف کے ہاتھ کو اپنے گلے سے ہٹا دیا اور میرے قریب آکر بولی۔ "کیا سدھایا ہے تم نے اس جانور کو۔ مجھے نہیں معلوم تھا تم اس قدر عقلمند ثابت ہو گے جوزف"۔

ماریا کی نگاہوں میں واقعی حیرت تھی اور تعریف۔ جوزف خوش ہو کر بولا۔

"اب تو مجھ سے شادی کر لو"۔

ماریا ہنستے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی اور بولی۔

"فی الحال تو میرا ارادہ اس گدھے سے شادی کرنے کا ہو رہا ہے! یہ گدھا تو سونے کی کان ہے"۔

تھوڑی دیر کے بعد کامتا پرساد نے شراب کو بالٹیوں میں بھر کر کہا۔

"پونے تین بالٹی شراب واپس ملی ہے۔ ایک چوتھائی یہ گدھا ہضم کر گیا"۔

ماریہ نے ہنس کر کہا۔ "شکر کرو، یہ گدھا ہے۔ کوئی شرابی آدمی نہیں ہے۔ ورنہ پوری شراب ہضم کر جاتا"۔

جوزف بولا۔ "ایک چوتھائی پانی ڈال دو۔ کیا پتہ چلے گا"۔

میں نے سوچا۔ "دودھ میں پانی، شراب میں پانی ...."

کامتا پرساد نے پوچھا۔ "سیٹھ کہاں ہے؟"

ماریا نے کامتا پرساد کے کان میں کچھ کہا، پھر کامتا پرساد اور ماریا برآمدے کے اندر چلے گئے۔ میں نے موقع غنیمت سمجھ کر جوزف سے کہا۔

"مجھے جلدی سے گھاس دے دو۔ ورنہ میں ابھی بھوک سے گر جاؤں گا"۔

"میں نے سب بندوبست کر رکھا ہے پارٹنر"۔ جوزف بڑے پیار سے میرا کان اینٹھتے ہوئے بولا۔ "ہے ماریا۔ اندر سے گھاس لیتی آؤ"۔

ماریا اپنی دونوں گوری گوری بانہوں میں گھاس کے خوشے بھر بھر کر لائی اور اپنے ہاتھوں

سے مجھے گھاس کھلانے لگی۔ کئی بار اُس کی نازک انگلیاں میرے ہونٹوں سے جا لگیں۔ ایک بار تو میری زبان ان سے چھو گئی۔ آہ! ان انگلیوں کا ذائقہ کتنا ملائم اور لطیف تھا۔ جیسے اوائل بہار میں کوہستانی وادیوں میں اُگنے والی گھاس کے پہلے خوشوں کا ہوتا ہے۔

دو دن کے بعد کامتا پرساد ربڑ کی ایک موٹی ٹیوب اور ایک بڑا سا ہینڈ پمپ لے آیا اور بولا۔ "یہ گدھا کام چور ہے۔ یقیناً اس گدھے کے معدے میں گیلن شراب زیادہ سما سکتی ہے۔"

جوزف نے اعتراض کیا۔

"بے چارہ جہاں تک بھر سکتا ہے بھر لیتا ہے۔"

"جی نہیں۔" کامتا پرساد نے کہا۔ "ہم اس پمپ کے ذریعے اس گدھے کے معدے میں شراب بھریں گے جس طرح موٹر ٹیوب میں ہوا بھری جاتی ہے۔"

"میں نے کہا۔" میرا پیٹ ایک جاندار کا پیٹ ہے۔ وہ موٹر ٹیوب نہیں ہے۔" مگر میری ایک نہ سُنی گئی۔ ان لوگوں نے میرے مُنہ میں شراب ڈال کر پمپ سے شراب بھرنا شروع کی اور آہستہ آہستہ میرا پیٹ پھولنا شروع ہوا۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری آنکھیں ربڑ کے ٹائر کی طرح پھول گئی ہیں۔ میرا معدہ ایک ڈھول کی طرح پھول کر کُپا ہوتا جا رہا ہے۔ جب شراب میرے حلق سے باہر چھلکنے لگی تب جا کے ان کم بختوں نے میرا پیچھا چھوڑا۔

کامتا پرساد نے مسکرا کر فاتحانہ انداز میں کہا۔ "پوری چھ بالٹی شراب میں نے بھری ہے۔ پہلے سے دُگنی۔"

جوزف نے کہا۔ "گویا ہم پہلے سے دُگنا منافع کمائیں گے۔"

"ارے ظالمو! میرا پیٹ پھٹ جائے گا۔" میں درد اور تکلیف سے چلا کر بولا۔

جوزف نے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا۔

"صرف پانچ منٹ کا تو راستہ ہے۔ یوں چٹکیوں میں طے ہو جائے۔ اب ہم تم کو ماہم کے چوک پر مل جائیں گے۔"

کامت پرساد نے کہا۔ "اگر ہم دو چار منٹ دیر میں پہنچیں تو فکر مت کرنا۔" پھر وہ جوزف کی طرف مڑکر بولا۔ "اس خوشی میں ایک ایک پیگ ہو جائے۔"

"ہو جائے۔"

ان دونوں کو پیتے چھوڑکر میں ماہم کریک کی جانب روانہ ہو گیا۔ آج کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا، اور میں پہلے دونوں دنوں کی طرح چوکی سے بے خوف و خطر گزر گیا۔ اور ماہم کے چوک پر پہنچ کر میں ایک فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر جوزف اور کامت پرساد کا انتظار کرنے لگا۔

جہاں میں کھڑا تھا وہاں ٹیکسیوں کا اڈہ تھا۔ اڈے کے پیچھے فٹ پاتھ پر ایک کبابیا تکے اور کباب پراٹھے لے کر بیٹھا تھا۔ قریب میں چارپائیاں بچھی تھیں جس پر چند مشتبہ قسم کے لوگ صبح کے ناشتہ کے لیے کباب اور پراٹھے کھا رہے تھے۔ اور سٹے کے نمبروں کی باتیں کر رہے تھے۔

میں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور ایک طرف کھڑا ہو کر جوزف اور کامتا پرساد کا انتظار کرنے۔ میں اپنے جسم میں شدید تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ ہر لحظہ ایسا گمان ہوتا تھا گویا میرا پیٹ ابھی پھٹ جائے گا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ جلدی سے جوزف آئے اور مجھے اس اندھیری گلی میں لے جاکر میرا پیٹ خالی کر دے۔ اب میں اس کمزور لمحے پر لعنت بھیج رہا تھا جب میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر یہ دھندا شروع کیا تھا۔

پانچ منٹ گزر گئے، دس منٹ گزر گئے، آدھ گھنٹہ گزر گیا، مگر جوزف اور کامتا پرساد کہیں دکھائی نہ دیے۔

ہولے ہولے میرا نشہ بڑھتا جا رہا تھا، میرا سر گھوم رہا تھا۔ شراب میری رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ہوا میں اُڑ رہا ہوں۔ پہلے تو میں نے سرور کے عالم میں زور کی ایک ہانک لگائی جسے سن کر ارد گرد کے سب لوگ اُچھل پڑے پھر میں نے گانا شروع کر دیا۔

"آوارہ ہوں، میں آوارہ ....."

لوگوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولے۔

"گدھا گاتا ہے"

گیت کی دھن پر میرے قدم خود بخود ناچنے لگے۔

"ارے ناچتا بھی ہے"

میں نے جھوم کر کہا۔"یارو مجھے معاف کرو۔ میں نشے میں ہوں"

میرا نشہ دم بدم بڑھ رہا تھا۔ لوگوں کا ہجوم بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے لہک لہک کر چلانا شروع کیا۔" دو گھونٹ میں نے پی، اور سیر جنت کی کری"

"عجیب خوش مذاق گدھا معلوم ہوتا ہے" ایک شخص بولا۔

دوسرے نے کہا۔" بیسویں صدی کا معجزہ ہے یارو! انسان کی طرح بولتا ہے"

" یہ بمبئی ہے، بمبئی" تیسرے نے کہا "یہاں گدھے بھی آکر انسانوں کی طرح بولنے لگ جاتے ہیں"

چوتھے شخص کو میں نے پہچان لیا۔ یہ چکن کا کرتا پہنے ہوئے تھا جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ اور نہایت باریک نفیس ململ کی دھوتی زیب تن تھی۔ اس شخص نے اپنے ساتھی کو جو تہمد پہنے ہوئے تھا کہا۔

" جمن! تم نے آج تک بولتا ہوا گدھا دیکھا ہے؟"

"نہیں سیٹھ بھسوڑی مل آج تک تو نہیں دیکھا۔ قسم لے لو"

سیٹھ بھسوڑی مل اور جمن دونوں کو میں کبابیے کی دوکان کے قریب چارپائی پر بیٹھے کباب پراٹھے کھاتے دیکھ چکا تھا۔ سیٹھ بھسوڑی مل نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یار جمن! مجھے تو کچھ گول مال لگتا ہے"

"کیسا گول مال سیٹھ؟"

"میرے خیال میں یہ گدھا نہیں ہے۔ کوئی یوگی۔ سادھو، سنت، مہاتما معلوم ہوتا

ہے۔ جس نے ہم دُنیا داروں سے بچنے کے گدھے کا بھیس دھارا ہے۔"

جمن نے کہا۔"تم ٹھیک کہتے ہو سیٹھ، مجھے بھی کوئی باکمال عامل معلوم ہوتا ہے جس نے قبر سے کسی روح کو نکال کر اس گدھے کے جسم میں قید کر دیا ہے۔"

سیٹھ بھسوڑی مل بولا۔"آؤ، اس کے پاؤں پڑ جائیں اور اس سے سٹے کا نمبر دریافت کر لیں۔"

یہ کہتے ہی سینکڑوں لوگوں کے سامنے سیٹھ بھسوڑی مل نے میرا ایک پاؤں پکڑ لیا، اور فرطِ محبت سے تقدس آمیز لہجے میں بولا۔"میں نے پہچان لیا یوگی مہاراج، میں نے پہچان لیا۔"

جمن نے میرا دوسرا بازو پکڑ کر کہا۔"کرامت والے فقیر، دستگیر، کرم کر دے۔ سٹے کا نمبر بتا دے۔"

"ہٹو یہ کیا بکواس ہے۔" میں نے لشتے کے باوجود اپنا پاؤں پرے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں چھوڑوں گا۔ نہیں چھوڑوں۔" سیٹھ بھسوڑی مل نے مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے میرا پاؤں پکڑ کر اُسے چومتے ہوئے کہا۔"جب تک سٹے کا نمبر نہیں بتاؤ گے نہیں بتاؤ گے نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک اپنے گیان میں انتر دھیان ہو کر نمبر نہیں بتاؤ گے، کبھی نہیں چھوڑوں گا۔"

جمن نے میرے دوسرے پاؤں کو بوسہ دے کر کہا۔"تیرے رحم و کرم کا صدقہ، ایک نمبر اس غریب کو بھی عطا کر دے۔ اگر تو جلال پر آجائے تو بندہ نہال ہو جائے۔"

ان کی دیکھا دیکھی دو تین اور آدمی میرے پاؤں پر گر پڑے۔ اور رو رو کر التجا کرنے لگے۔

"تجھے چوغہ سلوا دوں گا ساٹن کا۔"

"گر نمبر بتا دے کاٹن کا۔"

"تجھے حلوہ کھلاؤں گا ہر روز۔"

"ایک بار بتا دے اوپن تو کلوز۔"

نمبر...... نمبر...... کی بے تاب آوازیں مجمع میں سے بلند ہوئیں۔ مجمع میرے گرد بڑھ رہا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بمبئی میں لوگ سٹے کے کتنے عاشق ہیں۔ اب نمبر

بتائے بغیر جان کیسے چھوٹے گی۔ کوئی دم میں پولیس اب آیا ہی چاہتی ہے، اور میرا پیٹ، ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ابھی ابھی پھٹ جائے گا۔

میں بہت سے نقلی فقیروں، جوتشیوں اور سادھوؤں کو نمبر بتاتے دیکھ چکا تھا۔ اس لیے میں نے دولتی کی ٹیکنک اس وقت اختیار کرنا مناسب سمجھا پہلے تو میں نے دولتیاں جھاڑ کر اپنے لیے جگہ بنائی۔ پھر میں جھوم جھوم کر ناچنے لگا۔ اور اول فول بکنے لگا۔

"انتر، منتر، جنتر، کانگرس، لیگ سوتنتر، نہ ہندو سمجھے نہ مسلم جانے۔ کوئی چھرا بھونکے، کوئی خنجر تانے۔ ایک دل دو پیمانے ...."

سیٹھ بھسوڑی مل خوشی سے چلاتا ہوا بولا۔

"ایک دل دو پیمانے۔ یعنی اِکّے سے دُوا۔"

"نہیں۔" جمن مسرت کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "ایک دل دو پیمانے یعنی ایک میں جمع دو کرو تو ہوئے تین۔ اِکّے سے تیا۔"

"ارے نہیں۔" تیسرا بولا۔ "ایک دل دو پیمانے۔ دو سے ایک نکالو۔ باقی رہا ایک۔ اِکّے سے اِکّا آئے گا۔"

"غلط۔" چوتھا بولا۔ "نہ ہندو سمجھے نہ مسلم جانے۔ گویا نتیجہ صفر۔ یعنی بندی آئے گی۔"

سب لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق نمبر لگانے کے لیے بھاگے۔ ایک منٹ میں مطلع صاف تھا۔ میں فٹ پاتھ پر اکیلا کھڑا تھا۔

اتنے میں سامنے سے جوزف، ماریا اور کامنا پرساد آتے ہوئے دکھائی دیے۔ جوزف نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا ہوا تھا؟ لوگوں نے تمھیں کیوں گھیر لیا تھا؟"

میں نے کہا۔

"لاری کو اوور لوڈ کرو گے تو کیا انجن فیل نہیں ہو گا؟ ـــــ تم نے مجھے اوور لوڈ کر دیا۔ نتیجے میں مجھے نشہ ہو گیا۔ اور میں اول جلول بکنے لگا۔ اب انسانوں کی بولی بولنے لگا۔ اور تمھاری دُنیا ایسی ہے کہ اگر یہاں انسان گدھے کی بولی بولنے لگے تو کسی کو تعجب نہ ہو گا۔

لیکن اگر گدھا انسان کی طرح بات کرنے لگے تو ہر ایک کو تعجب ہو گا۔ اب جلدی سے میرے پیٹ سے شراب نکالو۔ ورنہ شاید میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔"

وہ لوگ جلدی سے مجھے گھسیٹ کر گلی میں لے گئے۔

ماریا کے گھر، صحن کے اندر پہنچ کر میں لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا۔۔۔ اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

❖

ہونا گرفتار سمگلنگ کے دھندے میں جوزف، ماریا اور کامتا پرساد کا
اور بھاگنا گدھے کا پولیس کے ڈر سے
اور ملاقات کرنا پارسی پاوا رستم سیٹھ سے
اور بیان بمبئی کے ریس کورس کا۔

جب میں ہوش میں آیا تو میں نے دیکھا کہ گلی کے باہر نکڑ پر ایک کونے میں بازار کی موری کے قریب پڑا ہوں۔ میرے منہ سے جھاگ بہہ رہی ہے اور بازار کے چند لونڈے مجھ سے ذرا دور کھڑے مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں۔
میں نے اچھی طرح سے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کان پھٹپھٹائے ٹانگیں سیدھی کیں، تو مجھے محسوس ہوا کہ میرا پیٹ بہت ہلکا ہو چکا ہے۔ اور میرا نشہ بھی قریب قریب اُتر چکا ہے۔ مگر جوزف، ماریا اور کامتا پرساد غائب تھے۔ ان ظالموں نے میرے پیٹ سے شراب نکال لی تھی اور غالباً مجھے مُردہ سمجھ کر گلی سے گھسیٹ کر میری لاش کو بازار کے کونے میں پھینک کر چلے گئے تھے۔
یوں ہی ہوتا ہے۔
بزنس کی دنیا میں یوں ہی ہوتا ہے۔
جب کوئی مرد کام کے قابل نہیں رہتا تو اسے ایک لاش کی طرح گھسیٹ کر بے کاری کے کوڑے کرکٹ میں پھینک دیا جاتا ہے۔ پہلے تو وہ انسان کے جسم سے زندگی کا عرق اور خون کی آخری بوند کڑی محنت کے پمپ سے نکال لیتے ہیں پھر دھکا دے کر

موری میں پھینک دیتے ہیں۔

جب انسان انسانوں کے ساتھ یہ سلوک کرتا ہے تو پھر میں تو ایک گدھا ہوں ۔ مجھے صبر کرلینا چاہیۓ اور شکر ادا کرنا چاہیۓ کہ ان لوگوں نے میری جان بخشی کردی۔

میں یوں ہی سوچ رہا تھا کہ اتنے میں میں نے کنکھیوں سے دیکھا، ماہم کے چوک سے جوزف ، ماریا، اور کامتا پرساد چلے آرہے ہیں تینوں کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں ہیں اور ان کے ساتھ پولیس کے دو سپاہی ہیں۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے میں ان لوگوں نے مجھے دیکھ لیا۔

ماریا نے چلا کر کہا۔"وہ رہا گدھا"

پولیس کا ایک سپاہی میری طرف بھاگا۔

اسے دیکھتے ہی میں بھی بھاگا۔

"پکڑو۔ پکڑو" پولیس کے سنتری نے شور مچایا۔

مگر میرے قدموں کو جیسے پر لگ گئے تھے۔ میں خوف سے چیختا، چلاتا، ہمکتا، ہنہناتا، دولتیاں جھاڑتا ماہم کے بازار کے بیچوں بیچ بھاگتا ہوا، دوڑتا ہوا شیواجی پارک تک چلا گیا۔ پولیس والے ایک جیپ لے کر میرا پیچھا کرنے لگے مگر پھر بھی میں اپنی روح کی پوری طاقت سے بھاگنے لگا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں گرفتار ہوگیا تو وہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

ہری نواس کے اڈے سے میں شیواجی پارک کی طرف بھاگا۔ جیپ میرے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ میں نے ایک زقند بھری اور شیواجی پارک کی دیوار سے اچھل کر میدان میں آرہا۔ جیپ چھلانگ نہ لگا سکتی تھی، لہٰذا وہیں رک گئی پھر چکر کاٹ کر شیواجی پارک کے دروازے کی جانب روانہ ہوگئی جو یہاں سے بہت دور تھا۔ جب تک میں شیواجی پارک کا میدان پار کرکے فٹ بال کھیلنے والی ٹیموں کے درمیان

سے گزرتا ہوا، کرکٹ کی وکٹیں اُڑاتا ہوا، ورلی سائیڈ کی دیوار پھلانگتا ہوا دوسری طرف جا پہنچا، اور وہاں سے سرپٹ بھاگتا ہوا تیر کی طرح سنسناتا ہوا ٹریفک کے تمام قوانین توڑتا ہوا ورلی سی کے بیچ پر جا پہنچا۔

سمندر کے کنارے پہنچ کر میری ٹانگوں نے مجھے جواب دے دیا، اور میں بے بس اور نڈھال ہوکر سمندر کے کنارے لیٹ گیا۔

ورلی کا نظارہ بہت خوب صورت تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی سمندر ایک نیم دائرے کی صورت میں پھیلا ہوا تھا۔ اُوپر آسمان محراب کی صورت میں جھکا ہوا تھا، جس پر شفق کی جھالریں اور رنگین بادلوں کی جالیاں آویزاں تھیں۔ ان رنگا رنگ جھالروں اور ہریلیوں کے جھلملاتے ہوئے حسن نے مجھے مسحور کر دیا اور میں نے سوچا، یہ خوب صورتی مجھ سے کتنی دور ہے۔ بڑھتی ہوئی بھوک، بے کاری اور جرم کی اس دُنیا میں ایک عام گدھے کے لیے کہیں آرام نہیں ہے کیا ایسا کوئی زمانہ آئے گا جب میں حسن کی اس اُونچی محراب کو چھو سکوں گا۔؟

ابھی تو ناممکن معلوم ہوتا ہے، میں نے دل میں سوچا۔ ابھی تو زندگی اکثر جگہوں پر ایک گدھے کی سطح سے اوپر نہیں اٹھی ہے۔ ابھی حسن بہت دور ہے۔ انصاف کی محراب بہت اُونچی ہے، اور میں ایک گدھا ہوں جس کا پولیس پیچھا کر رہی ہے۔

میں نے تھک کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اب جو ہو سو ہو۔ چاہے پولیس آئے اور مجھے گرفتار کرے۔ چاہے سمندر کی ایک بڑی اچھال آئے اور مجھے اپنی لہروں میں سمیٹ کر سمندر کے نیچے پہنچا دے۔ اس وقت میں اس قدر تھک چکا ہوں کہ ہر انجام کے لیے تیار ہوں۔

میرے کانوں میں ایک موٹر کے رُکنے کی آواز آئی۔ میں نے سمجھا پولیس کی جیپ آگئی۔ لیکن میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اسی طرح لیٹا رہا۔

موٹر کے پٹ بند ہونے کی آواز آئی۔ پھر قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ پھر وہ قدم میرے قریب آکر رک گئے۔ مگر میں اسی طرح آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔

پھر میرے کانوں میں آواز آئی۔
"کھیم جی! کہیں سے ایک اوپن ٹرک لاؤ۔"
"اس کا کیا کروگے رستم سیٹھ؟" دوسری آواز نے پوچھا۔
"ہم اس گدھے کو لاد کے اصطبل میں لے جائے گا۔"
"کاہے کو سیٹھ؟"
"تم اس وقت جاستی بات مت کرو، ہمارا کھوٹی مت کرو" رستم سیٹھ نے حاکمانہ لہجے میں کہا۔ "ابھی پولیس والا ادھر آتا ہوگا۔ اُن لوگ کے آنے سے پہلے ہم اس کو اپنے اصطبل میں لے جانا مانگتا۔"
"بہت اچھا سیٹھ۔ ابھی لاتا ہوں" دوسری آواز نے انکساری سے کہا اور پھر قدموں کی چاپ دور ہوتی گئی۔ غالباً کھیم جی ٹرک کرنے گیا تھا۔ اب مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ جو کوئی بھی یہ لوگ تھے، پولیس والے ہرگز نہ تھے اس لیے میں نے بے خطر ہوکر اپنی آنکھیں کھولیں۔
میں نے دیکھا کہ ایک سرخ چہرے والا۔ لمبی مڑی ہوئی ناک والا، گنجے سر اور سپید بالوں کی کنپٹیوں والا ایک دراز قد پارسی باوا ہے جو میرے اوپر جھکا ہوا ہے اور مجھے شفقت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

بعد میں مجھے رستم سیٹھ نے بتایا کہ میں ان کے اصطبل میں مسلسل تین چار دن جانکنی کی حالت میں بیمار رہا۔ رستم سیٹھ نے میرے علاج کے لیے بہترین ویٹرنری ڈاکٹر بلوائے، جو جانوروں کا علاج کرنے میں ماہر سمجھے جاتے تھے مگر چوں کہ یہ سب کے سب ہندوستانی تھے اس لیے ٹھیک طرح سے میرا علاج نہ کرسکے۔ رستم سیٹھ کے خیال میں مجھے ایک فارین ایکسپرٹ کی ضرورت تھی جو صحیح طریقے سے میرے مرض کی تشخیص کرکے میرا علاج کرسکے۔ بدقسمتی یہ تھی کہ بمبئی میں اس وقت کوئی ایسا ڈاکٹر

موجود نہ تھا جس نے اپنی زندگی گدھوں کے علاج میں گزاری ہو۔ کیوں کہ بے چارے گدھے فیس نہیں دے سکتے اور بمبئی میں جتنے ڈاکٹر ہیں سب فیس لیتے ہیں۔

مگر رستم سیٹھ کے ہاں فیس کی کمی کا تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ مسئلہ گدھوں کے علاج کے تجربے کا تھا۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد معلوم ہوا کہ ہانگ کانگ میں ایک انگریز ڈاکٹر میکنیلے رہتے ہیں جو گدھوں کا علاج کرنے میں ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ اور چوں کہ انگریزوں کو گزشتہ دو سال سے ایشیائی گدھوں کے امراض کا تجربہ رہا ہے، اس لیے رستم سیٹھ نے بذریعہ ہوائی جہاز اسے فوراً میرے علاج کے لیے بلا لیا۔ اور انھوں نے آتے ہی میرے مرض کی صحیح تشخیص کر کے فوراً میرا علاج شروع کر دیا۔

یہ تمام باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئیں۔ اس وقت مجھے اتنا یاد ہے کہ تین چار دن کی بے ہوشی کے بعد جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں نے اپنے آپ کو لکڑی کی ایک بڑی مسہری پر لیٹا ہوا پایا۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ میرے سر کے پیچھے بڑے بڑے آرام دہ ربڑ فوم کے تکیے رکھے ہوئے تھے۔ ایک نرس میرے بائیں طرف کھڑی تھی۔ دائیں طرف ڈاکٹر میکنیلے بڑے غور سے کانچ کی چند نلکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ رستم سیٹھ میرے پاس کھڑے تھے اور بڑی محبت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

"میرے اصطبل میں۔" رستم سیٹھ نے بتایا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"تمھاری رگوں میں خون ڈالا جا رہا ہے۔"

"بولو نہیں۔" ڈاکٹر میکنیلے اپنے لبوں پر انگلی رکھتے ہوئے بولے۔ "آرام۔"

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے جسم کے رگ و پے میں اک جان بخش توانائی کی رَو دوڑ رہی ہے۔ دھیرے دھیرے مجھ میں طاقت واپس آ رہی۔ ہولے ہولے اک سکون دہ ملائم، ریشمیں غنودگی مجھ پر چھا رہی ہے

اور میں آنکھیں بند کرتے ہی سو گیا۔

پتہ نہیں کتنے عرصے کے بعد میں پھر جاگا، لیکن جب جاگا تو دیکھا کہ رات کا وقت ہے میری مسہری کے پاس ایک نیلگوں شیڈ کا ٹیبل لیمپ روشن ہے اور اس کے قریب ایک آرام کرسی پر ماریا بیٹھی ہے۔

"ماریا! - تم؟ - یہاں کہاں؟" - مارے خوشی اور حیرت کے میرے مونہہ سے اک چیخ سی نکل گئی۔

ماریا کی بڑی بڑی مہربان آنکھوں نے مجھے ایک لمحے کے لیے گھبرا سا دیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی۔

"تمھیں رستم سیٹھ نے خرید لیا ہے۔ جوزف تمھیں لینے کے لیے آیا تھا۔ مگر رستم سیٹھ نے اسے پانچ ہزار روپے دے کر تمھیں اس سے خرید لیا ہے اور مجھے تمھاری دیکھ بھال کے لیے نرس مقرر کیا ہے۔ دو اور نرسیں بھی ہیں۔ ہم تینوں باری باری ڈیوٹی دیتی ہیں۔ کہو کیا حال ہے تمھارا؟ کیسے محسوس کرتے ہو؟"

"مگر پانچ ہزار روپے؟" ایسی شدید حیرت تھی مجھے کہ میری آواز بیٹھ سی گئی۔ "پانچ ہزار روپے؟ ذرا سوچو تو ماریا۔ ہندوستان میں کسی گدھے کی اتنی قیمت نہ پڑی ہوگی۔"

"ہاں" ماریا نے اقرار کیا۔ "ورنہ یہاں جتنے گدھے ہیں، روزانہ چند آنوں کی اُجرت پاتے ہیں، اور بڑی مشکل سے دن میں ایک بار گھاس کھاتے ہیں۔ تمھاری قسمت تو واقعی اپنی قسم کا ایک ریکارڈ ہے! حالاں کہ سُنا ہے کہ تمھاری نسل اچھی نہیں۔"

"ایک غریب گدھے کی نسل کہاں اچھی ہو سکتی ہے؟" میں نے عاجزی سے کہا۔ "آج کل اچھی نسل تو ایک اچھی نسل کی گاڑی رکھنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک کیڈی لیک یا رولز رائیز۔ پیدل چلنے والے..... کی کیا نسل اور کیا خاندان؟ اسی لیے میں تعجب کر رہا ہوں کہ رستم سیٹھ نے مجھے پانچ ہزار روپے خرچ کر کے کیوں خرید لیا۔؟"

ماریا نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کئی بار گھمائیں۔ اپنے نازک کندھے اُچکائے اور بولی۔

"کیا معلوم؟۔ مگر مجھے یہ معلوم ہے کہ انھوں نے تمھارے علاج پر اب تک لاکھوں روپے خرچ کر دیئے ہیں۔ مجھے تو رستم سیٹھ نہایت شریف انسان معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے تمھیں خواب میں میرا نام دو بار بڑبڑاتے ہوئے سُنا۔ اور فوراً مجھے معقول تنخواہ دے کر نرس کے کام کے لیے نوکر رکھ لیا۔" ماریا یہ کہتے کہتے کچھ شرما سی گئی۔

میں نے بھی اس کے نازک جذبات کا احترام کرتے ہوئے موںہہ پھیر لیا اور گلوگیر لہجے میں بولا۔

"رستم سیٹھ میرا محسن ہے۔ اس نے میری جان بچائی ہے۔ وہ ایک شریف انسان ہے۔ اس کے دل میں انسانیت کا درد معلوم ہوتا ہے۔ غریبوں کے لیے ہمدردی، اور گرے ہوؤں کے لیے شفقت، میں تاقیامت ایسے آدمی کا احسان نہیں بھول سکتا۔" میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ممکن ہے میں کچھ اور بھی کہتا۔ مگر اتنے میں ڈاکٹر میکنیلے تشریف لے آئے اور انھیں دیکھتے ہی ماریا اُٹھ کھڑی ہوئی، اور ڈاکٹر کا اشارہ پاکر کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں تو اس کی کمر کے لچک دار خم کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" ڈاکٹر میکنیلے نے میری نبض ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

"بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں ڈاکٹر! تھینک یو ڈاکٹر۔"

ڈاکٹر میکنیلے مسکرائے۔ انھوں نے میری نبض دیکھنی چھوڑ دی اور اپنی آرام کرسی میری مسہری کے قریب گھسیٹتے ہوئے بولے۔ "تمھیں اصل میں رستم سیٹھ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ اگر وہ وقت پر مجھے نہ بلاتے تو تمھاری جان بچنا مشکل تھا۔"

"مجھے کیا بیماری تھی ڈاکٹر؟"

"OVER – EATINS زیادہ کھانا۔"

"میری بیماری زیادہ پینے سے ہوئی ہوگی ڈاکٹر۔" میں نے کہا۔

"ایک ہی بات ہے۔ زیادہ کھانا زیادہ پینا ایک ہی مد میں آتے ہیں۔"

"مگر تجھے یاد ہے ...." میں نے اپنے حافظے پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس دن تو میں نے گھاس کا ایک تنکا نہ توڑا تھا اور اس سے پہلے بھی دو دن بارہ بارہ گھنٹے کے لیے مجھے کھانے کے لیے کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ آج تک تو مجھے یاد نہیں کہ خوش قسمتی کے چند دنوں کو چھوڑ کر مجھے کبھی پیٹ بھر کھانا ملا ہو۔"

"اسی لیے تو جب تمھیں پیٹ بھر کو کھانے کو ملتا ہے تو تم زیادہ کھا جاتے ہو اور بیمار پڑ جاتے ہو۔ میں نے اکثر گدھوں میں یہی بیماری دیکھی ہے۔"

"یہ تو کوئی بیماری نہیں ہے ڈاکٹر!" میں نے احتجاج کیا۔ "اصل مرض تو بھوک ہے۔ جس سے سب گدھے مرتے ہیں۔"

"بھوک کا ہم علاج نہیں کر سکتے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "بھوک ایک لا علاج مرض ہے۔"

"اور بے کاری؟"

"بے کاری کا بھی کوئی علاج نہیں ہے۔"

"اور جہالت؟"

"جہالت بھی لا علاج ہے۔ بلکہ خطرناک ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "جہاں جہاں گدھوں کو تعلیم دی گئی ہے، حکومتیں الٹ گئی ہیں۔"

میں چپ ہو گیا۔ میں نے سوچا ڈاکٹر سے الجھنا فضول ہے۔ ممکن ہے علاج ہی کرنا بند کر دے اور واپس ہانگ کانگ چلا جائے۔ اس لیے میں نے بات پلٹتے ہوئے کہا۔

"تو آپ کے خیال میں میری بیماری زیادہ گھاس کھا جانے سے ہوئی ہے؟"

"بلا شبہ۔"

میں نے سوچا۔ "ڈاکٹر صاحب کہیں آپ ہی تو گھاس نہیں کھا گئے ہیں؟" مگر میں دل پر جبر کر کے چپ رہا۔

ڈاکٹر میکینلے بولے۔ "تم ایک پڑھے لکھے گدھے ہو۔ میں نے اخباروں میں تمھارا حال پڑھا تھا۔ اسی لیے تمھیں بتاتا ہوں کہ تمھارا مرض بہت خطرناک تھا۔ ایک تو زیادہ کھا جانے کی بیماری، اوپر سے خون خراب تھا۔"

"خون خراب تھا؟"

"ہاں! جو گدھا پڑھ لکھ جائے۔ اس کا خون اکثر خراب ہو جاتا ہے دماغ بھی خراب ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں نے آتے ہی تمہارے پیشاب پاخانے، خون، تھوک اور پسینے کا معائنہ کیا۔"

"پسینے کا بھی معائنہ ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"ہاں۔ پھر دل، دماغ، پھیپھڑے، جگر، گردے، پتی، معدے کا ایکس۔رے کیا۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ پڑھنے لکھنے سے تمہارا خون بہت خراب ہو چکا ہے۔ اس لیے جب تک تمہارے جسم میں کسی ان پڑھ گدھے کا خون داخل نہیں کیا جائے گا، تم ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ رستم سیٹھ کا خیال تھا کہ بمبئی میں کسی ان پڑھ گدھے کا ملنا مشکل ہے مگر جب اشتہار دیا گیا تو ہزاروں گدھوں کی درخواستیں موصول ہوئیں جو دس روپے سے کر گھاس کے ایک گٹھے تک کے لیے اپنا خون بیچنے کو تیار تھے۔ رستم سیٹھ کو بڑی حیرت ہوئی۔"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ غریبوں نے آج تک اپنا خون ہی بیچا ہے۔"

ڈاکٹر کے گال میری بات سن کر سرخ ہوتے ہوئے قرمزی شہابی ہو گئے وہ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولا "معلوم ہوتا ہے تمہارا دماغ ابھی تک بیمار ہے۔ ابھی تمہیں اور خون کی ضرورت ہے۔ ابھی تمہیں مزید ایک ہفتے تک اَن پڑھ گدھوں کا خون دیا جائے گا، اور پرانا خون نکال لیا جائے گا اور ایک ہفتے تک میں سمجھتا ہوں تمہارے جسم میں پرانے خون کا ایک قطرہ تک نہ رہے گا۔"

"کیوں میری امیدوں کا خون کرتے ہو ڈاکٹر۔"

ڈاکٹر ہنس کر بولا۔ "اچھا۔ اب میں چلتا ہوں، تم آرام کرو۔ رات زیادہ ہو چکی ہے۔"

دس بارہ دن کے بعد میں بالکل اچھا ہو گیا۔ اور اصطبل کے باہر میدان میں چہل قدمی

کرنے لگا۔ اور دوڑنے لگا۔ ڈاکٹر میکینیلے بھی اپنی بھاری بھرکم فیس لے کر ہانگ کانگ چلا گیا۔
ماریا ابھی تک میری دیکھ بھال کے لیے مقرر تھی۔ دوسری دونرسوں کو چھٹی کردی گئی تھی۔ چہل قدمی
کرتے وقت اکثر ماریا میرے ساتھ ہوتی تھی۔ اور اپنی دل کش باتوں سے میرا دل لبھاتی تھی۔

پھر ایک روز رستم سیٹھ میرے پاس آیا۔ اس کے ساتھ ایک حجام بھی تھا۔
رستم سیٹھ نے میری طرف اشارہ کرکے حجام سے کہا: "اس کے جسم کے سارے
بال مونڈ ڈالو۔ اور اس کے جسم کو ایک گھوڑے کے جسم کی طرح شفاف اور چکنا بنادو۔"
حجام نے کہا۔ "میں کانپور کا نائی ہوں۔ میں نے آج تک صرف انسانوں کے سر
گھونٹے ہیں۔"

"تو ایک گدھے کو مونڈ دینے میں کیا حرج ہے۔" رستم سیٹھ نے پوچھا۔
"ناں صاحب۔" حجام انکار کرتے ہوئے بولا۔ "میں کان پور کا نائی ہوں۔ اگر ان وگوں
کو پتہ چل گیا کہ میں ایک انسان کی بجائے ایک گدھے کو مونڈ دیا ہے، تو مجھے جات باہر
کردیں گے۔"

"انھیں بالکل پتہ نہیں چلے گا۔" رستم بولا۔ "اس کی میں گارنٹی لیتا ہوں۔"
حجام نے اپنی بھینگی آنکھ سے سر سے پاؤں تلک دیکھا۔ "میں ایک آدمی کے سر
گھونٹنے کے دو روپے لیتا ہوں۔ یہ تو گدھے کا پورا جسم ہے۔ میرا اُسترا بے کار ہو جائے گا۔
میری بال کاٹنے کی مشین بھی خراب ہو جائے گی۔ پھر مجھے گنگا اشنان بھی کرنا پڑے
گا۔ ناں صاحب! میں ایسا نیچ کام نہیں کروں گا۔ میں کان پور کا نائی ہوں۔"
جب حجام واپس چلنے لگا تو رستم سیٹھ نے اس کے ہاتھ میں سَو کا ایک نوٹ
تھما دیا اور بولا۔ "اب کرے گا؟"

"ارے کیوں نہیں کرے گا سیٹھ؟" حجام خوشی سے اُچھل کر بولا۔ "اپنا کام تو
بال کاٹنا ہے۔ چاہے آدمی ہو یا گدھا۔ اب کہو تو اس کی چٹیاں بھی رکھ دوں؟"
"نہیں نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" رستم سیٹھ نے گھبرا کر کہا۔ "اس
گدھے کا کوئی مذہب نہیں ہے۔"

دوڑنا گدھے کا مہالکشمی کے ریس کورس میں
اور پھر گھبرانا رستم سیٹھ کا پولیس سے
اور بنانا پروگرام گدھے کے قتل کا

حجامت کے بعد مجھے صابن اور گرم پانی سے کئی بار نہلایا گیا۔ خشک تولیوں سے میرا جسم کئی بار رگڑا گیا۔ پھر کئی دن تک میرے جسم پر زیتون کے تیل کی مالش ہوتی رہی اور آخر میں ایک عجیب و غریب پالش میرے جسم پر کیا گیا جس سے میرا جسم سر سے پاؤں تک ایک مشکی گھوڑے کی کھال کی طرح چمکنے لگا۔ ساری زندگی میں میں نے اپنے آپ کو کبھی ایسا خوب صورت نہ پایا تھا۔ اب تو کبھی کبھی ماریا بھی چھپی چھپی نگاہوں سے میری جانب تعریفی انداز سے دیکھ لیتی تھی۔

میں نے ماریا سے کہا۔

"یہ رستم سیٹھ ایسا فرشتہ خصلت، دیوتا سروپ انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ کیسی بے غرض اور ہمدرد پائی ہے اس نے۔ ارے اپنے سگے رشتہ دار ایسا سلوک نہیں کرتے ہیں جو اس نے مجھ سے کیا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھ جیسا گدھا بھی انسانیت پر ایمان لا سکتا ہے!"

ماریا نے کہا "خدا تمھارے اور میرے محسن کو ہمیشہ ہمیشہ زندہ رکھے۔"

اس گفتگو کے دوسرے دن ایک گھنی مونچھوں والا سانولے رنگ کا دوہرے

بدن کا ادھیڑ عمر کا آدمی جس کی نگاہیں میرے بدن کو برمے کی طرح چھیدتی تھیں۔ ایک ڈاکٹر کو لے کر آیا۔ سیٹھ رستم اور کھیم جی بھی ساتھ ہی تھے۔

ڈاکٹر نے میرا اچھی طرح سے معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "یہ تو مجھے گدھا معلوم ہوتا ہے۔"

رستم سیٹھ نے کہا۔ "اجی نہیں۔ یہ پیرو کا گھوڑا ہے۔ پیرو ریاست جنوبی امریکہ میں واقع ہے۔ وہاں کے گھوڑے دیکھنے میں بالکل گدھوں کی طرح ہوتے ہیں۔"

"بونا بھی ہے۔" گھنی مونچھوں والے آدمی نے اعتراض کیا۔

"وہاں کے گھوڑے اسی طرح کے بونے ہوتے ہیں۔" کھیم جی بولا۔ "سیٹھ نے اسے خاص طور پر پیرو سے منگایا ہے۔ ہندوستان میں آج تک اس نسل کا گھوڑا کبھی نہیں آیا۔ یہ ملی جلی نسل کا گھوڑا ہے۔ باپ ہسپانوی، ماں ساؤتھ امریکہ کی انڈین۔ دونوں کی کراس بریڈنگ سے یہ نسل تیار ہوئی ہے۔ دوڑنے میں بے حد عمدہ ہوتی ہے۔"

"ہونہہ۔" گھنی مونچھوں والے آدمی نے مشتبہ انداز سے سر ہلا دیا۔ پھر بولا "اس کا نام کیا ہے؟"

"گولڈن سٹار۔" رستم سیٹھ بولا۔

"ہونہہ۔" اب کے ڈاکٹر نے مشتبہ انداز میں سر ہلایا۔

پھر رستم سیٹھ گھنی مونچھوں والے آدمی اور ڈاکٹر کو ایک طرف لے گیا دونوں میں دیر تک کچھ کھسر پُھسر ہوتی رہی۔ اس کے بعد وہ دونوں ڈاکٹر اور مونچھوں والا آدمی چلے گئے اور سیٹھ کھیم جی کو لے کر خوشی سے مسکراتا ہوا میرے پاس آکر بولا۔

سب طے ہو گیا۔ کل سے تم کو مہالکشمی کے ریس کورس کے اصطبل میں منتقل کر دیا جائے گا۔"

"مہالکشمی کے ریس کورس میں کیوں؟"

"وہاں ایک مہینے بعد تمھیں کرسمس کپ والی ریس میں شامل کیا جائے گا۔"

"میں؟ ایک گدھا ہو کر گھوڑوں کی ریس کورس میں شامل ہوں گا؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "آپ لوگوں کی عقل تو سلامت ہے؟ آج تک کبھی کوئی گدھا کسی

گھوڑے سے تیز دوڑا ہے ؟"
رستم سیٹھ نے مسکرا کر کہا۔" تمھاری دوڑ کا تو ہم نے اسی دن اندازہ کر لیا تھا جس دن پولیس والوں نے تمھارا پیچھا کیا تھا، اور تم پولیس کی جیپ اور دوسری تیز رفتار گاڑیوں سے بھی تیز بھاگتے ہوئے ماہم سے ورلی سی بیچ تک چلے آئے تھے۔ میں اور حکیم جی اپنی چھوٹی سبز کار میں تمھارے پیچھے پیچھے تمھارا تعاقب کرتے رہے۔ میں نے تمھاری رفتار کا اسی دن اندازہ کر لیا تھا۔ اگر تم اسی رفتار کی تین چوتھائی رفتار پر بھی ریس میں دوڑو تو بھی تم سب گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ جاؤ گے۔"

میں نے حیرت سے کہا۔"سیٹھ جس دن تم نے میری جان بچائی تھی، کیا اسی دن تم نے یہ اندازہ کر لیا تھا؟"

سیٹھ ہنس کر بولا۔" اندازہ پہلے کر لیا تھا ــــ جان بعد میں بچائی تھی۔"

تو یہ بات تھی!

اس لیے سیٹھ نے میری جان بچائی تھی!!

"میں ایک گدھا ہو کر گھوڑوں کی ریس میں سمگل کیا جاؤں گا؟ ــــ ارے ماریا! ذرا سوچو تو یہ سمگلنگ کہاں کہاں نہیں ہے۔" میں نے کچھ اُداس اور پریشان ہو کر ماریا سے کہا۔"میرا جی نہیں چاہتا کہ میں ریس میں حصّہ لوں۔"

"سیٹھ نے تمھاری جان بچائی ہے۔ اس نے تمھارے علاج پر ہزاروں روپے خرچ کیے ہیں۔" ماریا نے سوال کیا۔"کیا اتنے بڑے محسن کا تم پر کوئی حق نہیں ہے؟ کیا تم اس کے احسان کا بدلہ نہیں چکاؤ گے؟"

"مگر اس کا کیا بھروسہ ہے کہ میں ضرور ہی یہ ریس جیت جاؤں گا! جس سپیڈ کی بات سیٹھ جی کرتے ہیں۔ اس وقت کی بات اور تھی۔ اس وقت میری زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اس وقت تو ایک گدھا بھی ایک گھوڑے سے تیز بھاگ سکتا ہے۔ نہیں ماریا، اس ریس میں میں حصّہ نہیں لوں گا۔"

"اچھی طرح غور کرو۔" ماریا بولی "تاریخ میں ایسا واقعہ کبھی پیش نہیں آیا جب ایک گدھا گھوڑوں سے ریس میں شریک ہوا ہو۔ تم پہلے گدھے ہو گے! ریس کورس میں اپنی قوم کے پہلے نمائندے!"

"ایسا مت کہو" میں نے پُوچھا "اور وہ سب لوگ کیا ہیں جو ریس کورس کی اندرونی سازشوں اور پیچیدگیوں سے ناواقف، ریس کورس کے ہر کھیل میں ہزاروں کی تعداد میں شامل ہو کر گاڑھی کمائی کے لاکھوں روپے ایک دوڑ پر لٹا دیتے ہیں؟ ان کو تم کیا کہو گی؟"

ماریا نے کہا۔

"سیٹھ نے مجھ سے کہا ہے کہ کامیاب بزنس کا سارا راز اسی میں ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو کہاں تک گدھا بنا سکتا ہے۔"

"میں ایسا کام کیوں کروں؟" میں نے کہا "جس سے عام لوگوں کے لاکھوں روپے کا نقصان ہو۔"

"تم اگر اس ریس میں شامل نہیں ہو گے تو بھی کیا فرق پڑے گا! ریس تو لوگ پھر بھی کھیلیں گے۔ ہاں اتنا ضرور ہو گا کہ ماریا بے چاری کی روزی ختم ہو جائے گی" ماریہ آہستہ سے بولی۔

"تمھاری روزی کیوں ختم ہو گی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تو تم کیا سمجھتے ہو؟ سیٹھ نے مجھے اب تک کیوں نوکر رکھا ہے؟" ماریا میری گردن پر ہاتھ رکھ کر بولی "ڈیر ڈنکی! کیا تم میری خاطر اس ریس میں حصّہ نہیں لے سکتے؟"

"تمھارے لیے تو اپنی جان بھی دے سکتا ہوں" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اگر تمھارا معاملہ بیچ میں ہے تو سمجھ لو یہ گدھا ضرور اس ریس میں دوڑے گا نہ صرف دوڑے گا۔ بلکہ ریس جیتنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔"

"ڈارلنگ" ماریا نے خوش ہو کر میری گردن پر ایک بوسہ ثبت کیا۔ "مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔"

"مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم بھی مجھ سے اس قدر پیار کرتی ہو۔" میں نے کسی قدر شرماتے ہوئے کہا۔ "آخر تو میں ایک گدھا ہوں۔"

"عشق کرنے کے لیے کسی حد تک گدھا ہونا لازمی ہے۔" ماریا نے شوخ لہجے میں جواب دیا۔ پھر وہ اپنی کمر کے زہریلے خم دکھاتی ہوئی اصطبل سے باہر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے خوشی کی ایک زوردار دولتی جھاڑی اور اصطبل کے دروازے سے سر نکال کر درباری بلپت میں ایک ایسی تان لگائی جس نے سارے اصطبل کو گونجا دیا۔

ماریا اصطبل سے نکل کر لان پر سے گزرتی ہوئی سیٹھ کے بنگلے کی طرف جا رہی تھی۔ سمندر کی ہوائیں اجنبی دیس کی خوشبوئیں لا رہی تھیں۔ دور اوپر ساتویں شام کا چاند ایک گدھی کے سم کی طرح شفاف تھا۔ اور آسمان کی گھاس میں ہر جگہ ستا[illegible]ے باجرے کے دانوں کی طرح چمک رہے تھے۔

ریس سے چند روز پہلے سے ہی گھوڑ دوڑ کے متعلق اخباری کالموں میں رستم سیٹھ کے نئے گھوڑے "گولڈن اسٹار" کا ذکر تھا۔ اس کے شجرۂ نسب کا ذکر تھا، جو نیم ہسپانوی نیم نیٹو بنایا گیا تھا۔ بیشتر کالم نگار اسی گھوڑے کے متعلق کوئی اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ اور انھوں نے اپنے پڑھنے والوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس بونے ناتجربہ کار گھوڑے پر اپنا روپیہ ضائع نہ کریں۔

ماریا اخباروں سے پڑھ پڑھ کر یہ تذکرے سناتی رہی اور انھیں سُن سُن کر میرا خون کھولتا رہا اور میں نے تہیہ کر لیا کہ ریس کے روز میں اس طرح دوڑوں گا جیسے میرے پیچھے بمبئی کی ساری پولیس جیپوں میں بیٹھی مجھے پکڑنے کے لیے آ رہی ہو۔ میں بھی ان کالم نگاروں کو دکھا دوں گا کہ اگر ایک گدھا چاہے تو اونچی سے اونچی نسل کے گھوڑوں کو مات دے سکتا ہے۔ ٹانگوں میں طاقت اور دل میں سچا عشق ہو تو کیا نہیں ہو سکتا؟

ریس کا دن آ گیا۔ مجھے کچھ عرصہ پہلے مہالکشمی کے اصطبل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اور کسی فوٹو گرافر کو میرا فوٹو لینے کی اجازت نہ دی گئی تھی۔ ریس سے ایک گھنٹہ قبل ماریا نے مجھے ڈٹ کر ٹھرا پلایا۔ اور ایک ڈاکٹر نے مجھے ایک انجکشن دیا میرے جسم و جان میں تیر کی سی سنسناہٹ آ گئی۔

ریس کورس کے سٹینڈ ہزاروں کھلاڑیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ جب لوگوں نے مجھے دیکھا تو مارے حیرت کے ان لوگوں کی چیخیں نکل گئیں اور تماشائیوں کے گروہ ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے۔

مارے غصے کے میرے مونہہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ میں نے دانت پیسے مگر خاموش رہا۔ اونرز گیلری میں ماریا سیٹھ رستم کے قریب کھڑی تھی اور اپنا گلابی رومال ہلا ہلا کر مجھے جرأت دلا رہی تھی۔ تماشائیوں کے ردِ عمل سے میں کس قدر آزردہ ہو گیا تھا مگر ماریا کو دیکھتے ہی میرا دل عزم و قوت سے معمور ہو گیا، اور میں ریس کے گھوڑوں کی قطار میں سب سے آخر میں کھڑا ہو گیا۔

ریس شروع ہوتے وقت بھی سب سے آخر میں تھا۔

ریس کے پہلے چکر میں بھی میں سب سے آخر میں تھا۔ جدھر جدھر میں گزرتا گیا تماشائی مجھ پر ہنستے گئے۔

"ابے یہ گدھا ہے، گدھا ـــــ اس ہسپانوی گھوڑے سے تو گدھے بھی تیز دوڑتے ہوں گے"

کسی تماشائی نے مجھ پر ایک روپیہ بھی لگانے کی ہمت نہ کی تھی۔

ماریا کا چہرہ فق تھا اور رستم سیٹھ کا زرد تھا۔

ماریا کے چہرے کو دیکھ کر میرے دل میں جوش اور ولولے کی ایک لہر سی اُٹھی اور میں نے دانت پیس کر ایسی زقند بھری کہ آدھے فرلانگ میں تین گھوڑوں سے آگے نکل گیا۔ پھر چوتھے گھوڑے سے، پھر پانچویں گھوڑے سے۔ پھر چھٹے گھوڑے سے پھر ساتویں گھوڑے سے۔

"بک اَپ گولڈن سٹار" ماریا خوشی اور حسرت سے چلائی۔

سارے سٹینڈ میں صرف اسی کی آواز گونجی۔ کیوں کہ اور کسی تماشائی نے مجھ پر داؤ نہ لگایا تھا۔ سب حیرت سے مونہہ کھولے کھڑے تھے۔ اب میرے آگے صرف دو گھوڑے تھے۔ اور وننگ پوسٹ صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔

"بک اَپ صبح کا تارا!" ہزاروں تماشائی "صبح کے تارے" کے لیے چلائے، جو ہم سب سے آگے تھا۔ اور جس پر ہزاروں تماشائیوں نے داؤ لگایا تھا۔

"بک اَپ ماہ پارا!" دوسرے تماشائیوں نے "ماہ پارا" کے حق میں پکارا۔ کیوں کہ انھوں نے ماہ پارا پر داؤ لگایا تھا، جو اس وقت نمبر دو پر تھا۔

"بک اَپ مائی ڈارلنگ گولڈن سٹار!" ماریا زور سے چلائی۔

اور اس کی آواز سنتے ہی میں آنکھیں بند کر کے جسم و روح کی پوری قوت سے دوڑا، ایک تیر کی طرح سنسناتا ہوا دونوں گھوڑوں کو پچاس گز پیچھے چھوڑتا ہوا وننگ پوسٹ سے آگے نکل گیا۔

بمبئی ریس کورس کی تاریخ میں ایسا واقعہ کبھی نہ ہوا تھا۔ گولڈن سٹار نے ایک سے نوّے کا بھاؤ دیا تھا۔ صرف سات ٹکٹ گولڈن سٹار پر لگائے گئے تھے جو سب کے سب رستم سیٹھ کے اپنے آدمیوں نے خریدے تھے۔

ماریا نے مجھ پر دو سو روپے لگائے تھے اُسے اٹھارہ ہزار روپے ملے۔

رستم سیٹھ نے مختلف بکیوں کے ہاں بھاری رقمیں لگائی تھیں۔ کچھ دوسرے گھوڑوں پر بھی داؤ لگائے تھے۔ ہار جیت کا سب کٹ کٹا کے اس نے جو اندازہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس نے گولڈن سٹار پر داؤ لگانے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ دو بکی ضرور فیل ہو گئے۔ مگر سیٹھ نے اڑھائی لاکھ روپیہ ایک ریس سے سمیٹ لیا۔

گولڈن سٹار!

ریس ختم ہونے کے بعد مجھے چند گھنٹوں میں جہالکشمی کے اصطبل سے سیٹھ کے اصطبل میں منتقل کر دیا گیا۔ سیٹھ نے خوب خوب میری پیٹھ ٹھونکی۔ ماریا نے مجھے پیار کیا۔ کھیم جی نے جو میرا جاکی تھا، مجھے گردن پر کئی بار تھپتھپایا اور میری درخواست پر رستم سیٹھ نے وعدہ کر لیا کہ ڈاکٹر رام اوتار کو میرے حساب میں دو ہزار روپے بھیج دیں گے۔ کیوں کہ سیٹھ سے پہلے ڈاکٹر رام اوتار نے میری جان بچائی تھی اور اس کا بل مجھ پر باقی تھا۔

رات کو ماریا نے مجھے اپنے ہاتھ سے کیوڑے کی خوشبو میں معطر ہری ہری گھاس کھلائی۔ اور مجھے اصلی سکاچ وہسکی پہلی بار چکھنے کو ملی۔ میں عالم سرخوشی میں دو بوتلیں ختم کر گیا سکاچ پیتے ہی مجھے گہری نیند آ گئی اور میں چوبی مسہری پر لمبی تان کر سو گیا۔

آدھی رات کے وقت یکایک میری آنکھ کھل گئی۔ میرے اصطبل کے باہر کچھ کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑکی بند ہوئی دیوار سے کان لگا دیئے۔ سیٹھ کی آواز آئی "اس معاملے کی گہری تفتیش ہوگی۔ دوسری ریس کا رسک لینا ٹھیک نہ ہوگا"

کھیم جی جاکی بولا۔ "مگر سیٹھ گولڈن سٹار نے تو آج کمال ہی کر دیا"

"تم نہیں سمجھتے ہو" سیٹھ بولا۔ "ہم رسک نہیں لے سکتے۔ جب تفتیش شروع ہوگی تو یہ ضرور پتہ چل جائے گا کہ ہم نے ایک گدھے کو گھوڑوں کی ریس میں شامل کیا ہے، اس حالت میں نہ صرف میرے اصطبل کو ریس کورس سے خارج کر دیا جائے گا، ہو سکتا ہے مجھے جیل بھی ہو جائے، دھوکہ دہی کے سلسلے میں، میں رسک نہیں لے سکتا۔ گولڈن اسٹار کو ختم کر دینا ہوگا"

"وہ کیسے؟" کھیم جی جاکی نے پوچھا۔

"تم اسے کسی بہلانے سے یہاں سے نکال کر لے جاؤ سمندر کے کنارے۔ مگر یہ گدھا ہے بڑا کائیاں۔ اُسے شبہ نہ ہونا چاہیئے۔ اس سے کہہ دو کہ یہاں پر تمھاری جان کے لیے خطرہ ہے۔ یہاں سے نکال کے اسے سمندر کے کنارے لے جاؤ اور پستول سے ہلاک کر کے سمندر میں اس کی لاش کو پھینک دو، کیوں ماریا؟"

"ہاں یہ ٹھیک ہے" ماریا کی آواز آئی "نہ گدھے کی لاش ملے گی نہ پولیس کسی

نتیجے پر پہنچے گی۔

پہلے تو میں خوف سے کانپ رہا، ماریا کی آواز سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تو یہ ہے میری محبت کا انجام ۔!

کھیم جی جا کی بولا۔"کچھ اچھا نہیں لگتا سیٹھ، جس جانور سے ہم نے لاکھوں روپے ایک ہی داؤ میں کمائے ہوں، اسے اس طرح ختم کر دینا کسی طرح اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

"احمق نہ بنو۔" سیٹھ نے تحکمانہ لہجے میں کہا " جب کسی گدھے سے مزید کسی فیض کی توقع نہ ہو تو اسے ختم کر دینا ہی اچھا ہے۔"

پھر کھسر پسر بند ہو گئی۔ پھر بہت دیر تک سناٹا رہا، اور رات کی خاموشی ایک خنجر بن کر میرے سینے پر لٹکتی رہی۔ اور میں سوچنے لگا، مجھے یہاں سے فوراً بھاگ جانا چاہیے۔ مگر کس طرح؟ اصطبل کا دروازہ بند تھا۔ اور ایک گدھا روشندان سے بھاگ نہیں سکتا۔

"کچھ نہیں ہو سکتا۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔" میں نے ناامیدی کے عالم میں اپنے آپ کو پکارا۔ "موت میرے سر پر کھڑی ہے۔"

پھر ہولے سے اصطبل کا دروازہ کسی نے کھولا۔ اور ایک تاریک سایہ اندر داخل ہوا۔

میں نے خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

اچانک کسی نے دیوار پر ہاتھ پھیر کر سوئچ دبایا۔ اصطبل میں روشنی ہو گئی میرے سامنے کھیم جی کھڑا تھا۔

"کیا ہے؟"

"اٹھو، چلو باہر۔"

"کہاں؟"

"سمندر کے کنارے۔"

"کیوں؟"

"ٹہلیں گے۔ تم سے بات کریں گے۔"

"یہیں بات کیوں نہیں ہو سکتی؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں بہت گرمی ہے اور ممکن ہے کوئی سن لے۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔"
کھیم جی جاکی بولا۔ "سمندر کے کنارے ٹہلیں گے اور تم سے دوسری ریس کے بارے میں باتیں کریں گے۔"

میں نے اپنے دل میں کہا۔
"اب تم اس ریس کے متعلق مجھ سے کیا بات کروگے جو میری موت تک جاتی ہے۔"
مگر میں چُپ رہا۔ کھیم جی نے میری گردن میں رسّی باندھی اور مجھے اصطبل سے نکال کر سمندر کے کنارے لے چلا۔

راستے میں اندھیرا تھا۔ ناریل کے پیڑ مارشل لا سپاہیوں کی طرح اپنے سیاہ سنتے رائفلوں کی طرح اُٹھائے کھڑے تھے۔ سمندر کی لہریں اک غضب ناک شور کے ساتھ ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ چاروں طرف آدم نہ آدم زاد....

بس ایک گدھا اور ایک آدمی۔
ایک قاتل۔
ایک مقتول۔

سمندر کے ساحل پر پہنچ کر کھیم جی نے مجھے کھڑا کر دیا۔ اور مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔

"جانتے ہو میں تمھیں یہاں کیوں لایا ہوں؟"
"ہاں" میں نے اُداس لہجے میں کہا۔ "تم میری جان لینے کے لیے یہاں مجھے لائے ہو۔"
کھیم جی نے اپنی جیب سے پستول نکال کر کہا۔ "تم نے میرا کام آسان کر دیا، اب اپنی موت کے لیے تیار ہو جاؤ۔"
"میں بالکل تیار ہوں۔ مگر میری ایک درخواست ہے۔" میں نے انکساری

سے کہا۔

کیا؟"

"جس آدمی نے پہلی بار مجھ پر سوار ہو کر ایک گدھے کو گھوڑوں کی ریس میں جتایا، میں مرنے سے پہلے اس آدمی کے ہاتھ چومنا چاہتا ہوں۔"

"اس میں کیا ہے۔" کھیم جی نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو جلدی سے چوم لو۔"

جونہی اس نے آگے ہاتھ بڑھائے، میں نے پلٹ کر اس زور کی دولتی جھاڑی کہ وہ چکرا کر ساحل کے پتھروں پر گر پڑا۔ اور میں اس موقع کو غنیمت سمجھ کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ تھوڑی دیر کے بعد کراہتے ہوئے کھیم جی کی گالیوں کی آواز آئی۔ مگر میں پیچھے دیکھے بغیر سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔ اور ریس کورس کی رفتار سے بھی تیز۔ پھر یکایک کئی گولیوں کی چلنے کی آواز آئی، اور کئی گولیاں میرے قریب سے سنسناتی ہوئی گزر گئیں۔

پھر ایک گولی پیچھے سے آئی۔ اور میری پچھلی داہنی ٹانگ کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔

میں چکرا کر گرنے کو ہی تھا۔ مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور دوڑتا چلا گیا۔

بازار، سڑک، موڑ، نکڑ مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ میں اپنی زندگی کے لیے بھاگ رہا تھا۔

بہت دیر بھاگنے کے بعد جو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دور دور تک کوئی نہ تھا۔ رات اکیلی تھی، سڑک اکیلی تھی۔ آس پاس کے سب بنگلے سوئے ہوئے تھے۔

یکایک اپنے آپ کو اکیلا پا کر میری ٹانگوں نے مجھے جواب دے دیا اور میں ناریل کے ایک پیڑ کے نیچے، ایک بنگلے کے دروازے کے باہر گر گیا۔

صبح کو جب بنگلے کے مالی نے مجھے ڈنڈے مار مار کر بھگانا چاہا تو مجھ سے اٹھا نہیں گیا۔ میری ٹانگ سوج گئی تھی۔ اس کے زخم سے خون بہہ بہہ کر سوکھ گیا تھا۔ اس لیے میں اس بے کسی کے عالم میں پڑا پڑا مار کھاتا رہا۔ اور درد سے ڈکراتا رہا۔

میری چیخیں سن کر بنگلے کا مالک باہر نکل آیا۔ وہ ایک چھوٹے قد کا سانولے رنگ کا آدمی تھا، جس کے بال کنپٹیوں تک غائب تھے۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور چمک دار تھیں اور وہ رُک رُک کر بات کرتا تھا اور الفاظ اُس کے ہونٹوں سے یوں نکلتے تھے جیسے کسی کشید کرنے والی نلکی سے قطرہ قطرہ کرکے بہہ رہے ہوں۔

"کیا بات مالی۔ یہ کون؟"

"گدھا، ماسٹر" مالی نے مجھے ڈنڈا مارتے ہوئے کہا۔

"ماسٹر" نے مجھے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اپنی ملبوتری ٹھوڑی کھجائی، جس پر فرنچ کٹ ڈاڑھی نمایاں تھی۔ پھر اس کی آنکھیں ایک دم چمکنے لگیں۔ جیسے کسی عمدہ خیال نے انہیں منور کر دیا ہو۔

"ہوں" وہ بولا۔ "یہ تو زخمی۔ اس کو اندر۔ فوراً۔ لاؤ۔"

مالی اس طرح چونکا جیسے اسے اپنے مالک سے ایک گدھے کے لیے اس ہمدردی کی توقع نہ ہو۔ وہ زیرِ لب کچھ بڑبڑایا۔ پھر رسّی لینے کے لیے اندر چلا گیا اس کے جاتے ہی مالک بھی اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد مالی اپنے دو نوجوان بیٹوں کو لے کر باہر آ گیا۔ وہ لوگ رسّوں سے مجھے گھسیٹ کر اندر لے گئے، اور ایک لان پر لے جاکر چھوڑ دیا۔ پھر اس کے جوان بیٹے مالی کے کوارٹر میں چلے گئے۔ اور مالی بنگلے کے اندر چلا گیا۔

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد مالک بنگلے کے اندر سے کچھ دوائیں اور پٹیاں لے کر نکلا۔ اس کے ساتھ ایک ملازم بھی تھا۔ مالک نے میرا زخم دھویا۔ نشتر سے آپریشن کر کے گولی نکالی۔ پٹی کی، مجھے ایک انجکشن دینے لگا۔

اتنے میں بنگلے کے اندر سے سرخ بالوں والی ایک مغربی حسینہ برآمد ہوئی۔ وہ ماسٹر سے کم سے کم ڈیڑھ فٹ اُونچی ہوگی۔ اس نے تیراکی کا ایک عمدہ بکنی سوٹ پہنا ہوا تھا ـــــ یعنی کمر پر ایک پھول دار چڈی اور سینے پر ایک رومال نما پھول دار کپڑا۔ بس! اس کا گورا، ننگا جسم بے حد متناسب اور حسین تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا جسم گوشت کی بجائے

سورج کی کرنوں کا بنا ہوا ہے۔

"ماسٹر؟" وہ حیرت سے چلائی "یہ جانور کون ہے؟"

جس لہجے میں اس مغربی عورت نے بات کی اس سے مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ عورت انگریز نہیں ہوسکتی، گو انگریزی میں بات کرتی تھی۔ ہمارے قریب آکر بولی۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"ڈنکی زخمی ۔ اس کو میں ۔ دیتا انجکشن" ماسٹر بولا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ بنگلے کے مالک کا نام ایچ بی ماسٹر تھا اور وہ ایک ڈاکٹر اور سائنسداں تھا۔

"وات؟ ۔ دونکی! پور دونکی ۔ پور پور دونکی" وہ عورت میرے قریب آکر جھکی اور میری گردن پر ہاتھ پھیرنے کے لیے اس نے اپنا شفاف ہاتھ پھیلایا۔

"دور ہٹ کولا" ماسٹر تحکمانہ لہجے میں چیخا۔ اور کولا گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی اور خوف زدہ ہوکر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر ماسٹر نے مڑکر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ بڑے اطمینان سے اس نے دو انجکشن مجھے لگائے۔ اور پھر دوائیوں کا بکس اور خالی سرنجیں نوکر کو دے کر کولا سے بولا۔

"پہن کر تم ——— ایسا ڈریس ——— آئیں سامنے ——— اجنبی کے ۔ بے شرم"

"مگر یہ تو ایک گدھا ہے ۔ جانور" کولا نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں چلیگا" وہ غصّہ سے بولا "بدلو اس کو ۔ اندر جاکر ۔ فوراً"

کولا بولی ۔ "مگر ڈارلنگ میں تو اس کو پہن کر سومنگ پول میں باتھ کرنے جا رہی تھی"

"نو باتھ ——— میرا حکم ۔ ڈریس بدلو ——— وہ چھوٹا سا آدمی ایڑیاں اٹھا کر غصّہ سے بولا۔

ایک لمحے کے لیے کولا کا چہرہ اس قدر لال ہوگیا کہ اس کے رخساروں اور اس

کے بالوں کے رنگ میں کوئی فرق نہ رہا۔ اس کی آنکھیں گہری سبز ہوگئیں اگر وہ چاہتی تو اس چھوٹے سے ننگے آدمی کو دو ہاتھ ایسے دیتی کہ وہ وہیں گر جاتا۔ مگر وہ ہونٹ چپ کر خاموشی سے مڑی۔ اور بنگلے کے اندر چلی گئی۔ ماسٹر مسکرانے لگا "نو نخرہ۔ نو لفڑا۔ ہم ماسٹر ہے"
ماسٹر میری طرف دیکھ کر اس طرح مسکرایا جیسے وہ داد طلب کر رہا ہو۔ بھلا میں کیا کہتا۔ اپنی آنکھیں جھپکائے بغیر دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر کچھ سوچتا ہوا اندر چلا گیا۔

لان پر دھوپ پڑنے لگی۔ میرے جسم میں خوشگوار گرماہٹ کی لہریں دوڑنے لگیں۔ پٹی سے اور انجکشنوں سے مجھے بہت فائدہ محسوس ہو رہا تھا۔ جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے شدید بھوک محسوس ہونے لگی۔ اتنے میں مالی کے دو بیٹے میرے لیے گھاس لے کر آ گئے اور مجھے کھلانے لگے۔

جب وہ مجھے گھاس کھلا رہے تھے۔ اس وقت دوسرے لان میں ایک رنگ دار چھتری کے نیچے ایک نوکر آکر ایک غالیچہ بچھا گیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد بنگلے کے اندر سے کولا اور ماسٹر برآمد ہوئے۔ کولا نے ایک عمدہ مغربی فراک پہن رکھا تھا۔ اور سر پر تولیہ نما ایک ٹوپی پہن رکھی تھی (جو بعد میں تولیہ ہی ثابت ہوئی) اس کے ہاتھ میں تیل کی دو شیشیاں تھیں۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر سیاہی مائل نیکر پہنے ہوئے چل رہا تھا۔ اس نیکر کے سوا وہ سر سے پاؤں تک ننگا تھا۔ دھوپ میں اس کا سُرمئی بدن یوں چمک رہا تھا جیسے وہ آدمی نہ ہو کسی بھینس کا تازہ پیدا ہوا بچہ ہو۔

وہ رنگ دار چھتری کے نیچے آکے غالیچے پر اوندھا لیٹ گیا، اور کولا تیل سے اس کی پیٹھ کی مالش کرنے لگی۔ ان دونوں کو دیکھ کر مالی کے دونوں بیٹے آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔

"جونہی مالک کی بیوی جاتی ہے اپنے ملک کو، یہ حرامجادی کولا فوراً آجاتی ہے"۔ ایک بولا۔

دوسرے نے کہا۔ "میں تو حیران ہوں، اتنی لمبی چوڑی میم اس چھوٹے میں کیا دیکھتی

ہے؟"

"پیسہ" پہلا ہنس کر آہستہ سے بولا۔

"پیسہ تو اس خبصورت میم کو کہیں بھی مل سکتا ہے"

"گاڑی" پہلا بولا۔

"نوکروں پہ کیسے حکم چلاتی ہے جیسے گھر کی مالکن یہی ہو۔ انگریزی میں گالی دیتی ہے"

دوسرے نے کہا۔

"مجھے کہیں اکیلے میں مل جائے تو......" پہلا اتنا کہہ کر چپ ہوگیا اور نہایت لذیذ

خیالوں میں کھو گیا۔

"ہم کو کیوں ملنے لگی؟" مالی کے دوسرے بیٹے نے اک آہ بھر کر کہا۔

"ماسٹر کی شکل تو دیکھو" پہلا بے حد بیزاری کے لہجے میں آہستہ سے بولا۔

"عورت شکل نہیں دیکھتی راجہ! پیسہ دیکھتی ہے"

پھر دونوں چپ ہوگئے۔ جیسے ہمیشہ کے لیے اس زندگی سے بیزار ہو چکے ہوں پھر

گھاس بھی ختم ہوگئی اور دونوں وہاں سے چلے گئے اور میں اپنے کان کھڑے کرکے دوسرے

لان کی گفتگو سننے لگا۔

کولا پوچھ رہی تھی۔

"اس گدھے کو رکھ کر کیا کروگے؟"

"تجربہ" ماسٹر بولا۔

"کیسا تجربہ؟"

"سیرم" (SERUM)

"کیسا سیرم؟"

"ناسور ـــ پرانا زخم ـــ سب ٹھیک ـــ دو دن میں" ڈاکٹر نے اسے

سمجھایا۔

"مگر مغرب میں تو اس کام کے لیے گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں ..... "

"انہی کے خون سے سیرم تیار ہوتا ہے۔ انہی پر تجربے کیے جاتے ہیں۔ ایسا میں نے سُنا ہے۔"

"گھوڑا مہنگا۔ گدھا سستا۔" ماسٹر دوٹوک بولا۔

"مگر....."

"نو اگر مگر۔ ہم ماسٹر۔ ہم سائنٹسٹ۔ یو شٹ اپ۔"

کولا ایک تلخ انداز سے مسکرا کر چپ ہوگئی۔ ماسٹر کی پیٹھ پر تیل کی مالش کرتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد ماسٹر نے کروٹ لی اور سیدھا لیٹ گیا اور اپنے دونوں ہاتھ کولا کی جانب بڑھا کر بولا۔ "کس می۔"

"نو۔" کولا انکار میں سر ہلا کر بولی۔

"کس می۔" ماسٹر نے بڑی بے چینی سے دونوں ہاتھ ہلا کر کہا۔

"تمہارے مُنہ پر تیل ہے۔" کولا نے اعتراض کیا۔

"نئی گاڑی مانگتا؟" ماسٹر نے پوچھا۔

کولا کے چہرے پر، ہونٹ شبنم میں بھیگے ہوئے گلاب کی مانند کھل گئے۔ ہنس کر بولی۔ "ہاں۔"

"کیڈی لیک؟"

"ہاں۔"

"کس می۔"

کولا نے خوش ہو کر اپنے دونوں بازو ماسٹر کے گلے میں ڈال دیئے۔

تجربہ کرنے کے دوران میں کئی بار ماسٹر نے میرے جسم سے خون نکالا، کئی بار داخل کیا۔ کئی بار طرح طرح کے انجکشن دیئے۔ جن سے میرے سارے جسم پر طرح طرح کے پھوڑے نمودار ہوگئے اور ان سے پیپ بہنے لگی۔ ماسٹر اپنی تجربہ گاہ میں مجھے ایک اندھیرے کمرے

میں بند کر کے رکھتا تھا۔ کسی وقت مجھے اکیلا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ میرے گلے میں دونوں وقت لوہے کی ایک موٹی زنجیر پڑی رہتی تھی۔

ایک روز مجھے بے حد تکلیف تھی۔ پھوڑوں سے پیپ اور خون بہہ رہا تھا سارے جسم میں بخار کی شدید حرارت تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں آج مر جاؤں گا۔ اب تک میں نے زبان نہ کھولی تھی۔ لیکن اپنی موت سامنے کھڑی دیکھ کر بولنا پڑا۔ وہ اس وقت میرے کمرے میں اکیلا کھڑا مجھے کسی دوا کا انجکشن دے رہا تھا۔

جب وہ انجکشن دے چکا تو میں نے کہا۔

"نیم حکیم خطرۂ جان۔"

وہ میری آواز سن کر حیرت سے اُچھل پڑا۔

"یو بولتا؟ یو ڈنکی بولا۔" اُس نے گھبرا کر پُوچھا۔ اور انجکشن کی سرنج اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔

"میں نے کہا۔" ہاں ماسٹر! میں بولنے والا گدھا ہوں۔ پڑھا لکھا گدھا ہوں تم نے میری کہانی اخباروں میں پڑھی ہوگی۔"

وہ حیرت سے وہیں کھڑے کا کھڑا تھا اور مونہہ کھولے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ آخر میں نے اس سے کہا۔

"آخر تم میری جان لینے پر کیوں تُل گئے ہو"؟

"تجربہ۔" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "میں ایک پڑھا لکھا گدھا ہوں ـــ میں تمھیں اپنی زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہ دوں گا۔"

وہ بولا۔ "تم بچ جاتا ـــ ہم تیار کرتا۔ اپنی ناسور سیرم ـــ تم مر جاتا ـــ ہوتا شہید۔ سائنس پر۔"

میں نے کہا۔ "میں شہید ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

"گدھا ہوتا۔ ہر جگہ شہید ۔۔ مرا کرتا۔ دوسرا لوگ ۔" وہ ہنس کر بولا اس کی ہنسی میں بڑی بے رحمی تھی۔

"خدا کے لیے میری بیڑیاں کھول دو۔ مجھے آزاد کر دو" میں درد اور دکھ اور خوف سے بے چین ہو کر چلایا۔

"شٹ اپ" ماسٹر زور سے چلایا اور کمرہ باہر سے بند کر کے چلا گیا۔

شاید قدرت کو میری زندگی منظور تھی۔ کیوں کہ اس واقعے کے چند روز بعد خود بخود میرے زخم اور پھوڑے اچھے ہونے لگے اور ایک مہینے کے بعد میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ مگر اس پر بھی اس ظالم نے مجھے کمرے سے باہر نہیں نکالا بلکہ مزید دو ہفتوں تک اپنے مشاہدے میں رکھا۔ آخر جب اسے یقین ہو گیا کہ میں بالکل صحت یاب ہو چکا ہوں تو وہ ایک روز میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں دواؤں کا ایک پیکیٹ تھا۔ اور وہ بے حد خوش معلوم ہوتا تھا۔ وہ آتے ہی بولا۔

"تجربہ کامیاب ۔۔ انٹی ناسور سیرم تیار۔ ریڈی فار سیل۔ پیٹنٹ حاصل" اتنا کہہ کر اس نے وہ پیکیٹ کھولا اور کھول کر اس میں سے اس نے مجھے بارہ مہر بند کانچ کی شیشیوں کے سیرم دکھائے۔ ایک سیرم کا رنگ لال تھا، دوسرا بالکل سفید تھا۔ وہ بولا۔ "ایک دن ۔ لال انجکشن ۔ دوسرے دن سفید انجکشن ۔ بارہ روز ۔ ناسور ٹھیک"

میں نے پوچھا۔

"یہ لال رنگ کی دوا کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "اینٹی ناسور سیرم"

"اور یہ سفید رنگ والی دوا؟"

"سفید پانی ۔ سادہ"

"پانی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں پانی" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "مگر سادہ پانی کے انجکشن دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تم صرف

اپنی ناسور سیرم کے انجکشن بیچو تو بارہ دن کے بجائے لوگوں کا ناسور چھ دن میں ٹھیک ہوا کرے گا۔"

وہ بولا۔ "پانی۔ نہیں دے گا تو۔ کدھر سے لے گا؟۔ جاستی نفع۔"

میں نے کہا۔ "تم کو زیادہ منافع کی ضرورت کیا ہے؟ تم ایک باعزت سائنسداں ہو۔ تمھاری اپنی ایک فیکٹری ہے دوائیوں کی، جس سے ہر سال تم کو تین چار لاکھ کا فائدہ ہو جاتا ہے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

وہ بولا۔ "ایک لڑکا پیرس پڑھتا۔ دوسرا لندن۔ دو لڑکی جوان۔ شادی ہونا۔ ایک بیوی۔ ایک میم صاحب۔ بڑا خرچہ مانگتا۔ ہم پانی بیچتا۔"

میں نے کہا۔

"اب تک میں سمجھتا تھا کہ تم صرف گدھوں کی زندگی سے کھیلتے ہو، اب معلوم ہوا تم انسانوں کی زندگی سے بھی کھیل سکتے! چار پیسوں کے لیے۔ دودھ میں پانی۔ شراب میں پانی۔ دوا میں پانی!"

وہ میری بات سن کر ہنسا اور بولا۔

"کھالی بیچتا۔ اِدھر ہم پانی۔ اُدھر ہمارا بڑا بھائی۔ بتاتا ایٹم بم! سائنسدان وہ۔ سائنسدان ہم۔"

"تم دونوں چور۔ گدھوں کے دشمن۔" میں نے جل کر کہا۔

بعد میں میں نے سوچا۔ ایچ بی ماسٹر سے لڑنا فضول ہے۔ اپنی آزادی کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ چند دنوں کے بعد میں نے اس سے کہا۔ "تمھارا تجربہ تو کامیاب ہو گیا۔ اب تو مجھے آزاد کر دو۔"

ماسٹر نے بڑی سختی سے سر ہلا دیا۔ "نیا تجربہ کرتا ہم۔ تم کو۔ بھوکا رکھتا۔"

میں نے گھبرا کر کہا۔ "مجھے بھوکا کیوں رکھو گے؟"

"نیا انجکشن بناتا ہوں۔ بھوک کا انجکشن۔"

"یہ بھوک کا انجکشن کیا ہوتا ہے؟"

ماسٹر نے مجھے دیر تک سمجھایا۔ اُس کی گفتگو کا مطلب جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ تھا کہ اس دُنیا میں بھوک بہت ہے۔ ہر انسان کو بھوک لگتی ہے۔ اُس کی بھوک مٹانے کے لیے اُسے روٹی کھلانی پڑتی ہے۔ ہر روز دو وقت۔ اور یہ بہت مہنگا سودا ہے۔ اس لیے میں کسی ایسے انجکشن کی تلاش میں ہوں جس سے انسان کو بھوک نہ لگے۔ بالکل بھوک نہ لگے یہ تو نہ ممکن ہے۔ لیکن ہاں ایسی دوا ضرور ایجاد کی جا سکتی ہے جس سے انسان کو آٹھ دس دن تک بھوک نہ لگے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوا غذا کا کام دے گی۔ ہرگز نہیں وہ تو صرف بھوک کو آٹھ دس دن کے لیے دبا دے گی۔ انسان ان آٹھ دس دنوں میں کمزور تو ہوگا مگر بھوک محسوس نہیں کرے گا۔ اور آٹھ دس دن تک بغیر غذا کے کام کر سکے گا۔ ذرا سوچو تو اگر میں یہ انجکشن ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو اس سے دُنیا بھر کے صنعت کاروں کو کتنا فائدہ پہنچے گا۔ ایک کارخانے کے ہزاروں مزدوروں کو ایک دن ایک انجکشن لگا دیا اور دس دن تک بغیر غذا کے ان سے کام لیا میں ایک ایسی ہی دوا کی ٹوہ میں ہوں، اور تمہارے خون سے اینٹی بھوک سیرم تیار کروں گا۔ اور ساری دُنیا میں پیٹنٹ کرا کے اُسے بیچوں گا......"

میں نے دل میں سوچا۔ لو میاں گدھے۔ پہلے تو آزادی گئی۔ اب گھاس سے بھی گئے۔ عجیب پاگل سائنس داں سے پالا پڑا ہے۔ میں اس کے سامنے بہت گڑگڑایا۔ رویا، گایا، بہت بہت اس کی منت سماجت کی۔ مگر ماسٹر کسی طرح سے مجھے آزاد کرنے پر تیار نہ ہوا۔

اب اس کا ہر روز کا معمول ہو گیا کہ وہ ہر روز مجھے ایک نیا انجکشن لگاتا۔ دن بھر مجھے بھوکا رکھتا اور رات کو پوچھتا۔ "بھوک لگی؟"

"لگ رہی ہے۔" میں نے بھوک سے بے چین ہو کر کہا۔ دوسرے دن اُس نے

پھر ایک نیا انجکشن لگایا، پھر شام کو پوچھا۔

"لگ رہی ہے؟"

لگ رہی ہے، ماسٹر ـــ سخت بھوک لگ رہی ہے ماسٹر"

ماسٹر جھلا کر لوٹ گیا۔

چوتھے دن اُس نے پھر مجھے نیا انجکشن دیا۔ پھر رات کو کہنے لگا ـــ "بھوک ختم ہوئی؟"

"ارے آج تو مجھے اتنی بھوک لگی ہے کہ اگر تم مجھے کھلا چھوڑ دو تو گھاس کی بجائے تمھیں کچا کھا جاؤں" میں نے انتہائی غصے میں کہا۔

دس روز کے بعد مسلسل بھوک سے میری پسلیاں نکل آئیں۔ زندگی میں اتنے لمبے عرصے تک میں کبھی بھوکا نہ رہا تھا۔ بھوک اور کمزوری کی شدت سے میرا سارا جسم کانپتا تھا۔ میں نے رو رو کر اس سے کہا۔ "مجھے تھوڑی سی گھاس دے دو۔ میری جان نہ لو، ماسٹر۔ ایسی کوئی دوا ایجاد نہیں کی جا سکتی جو بھوک کو مٹا دے ماسٹر! بھوک تو زندگی کی خاصیت ہے۔ زندگی مٹائے بغیر بھوک کو مٹانا مشکل ہے اور پھر اس بھوک کو مٹانا کیوں ضروری ہے؟ آج بھی اس دنیا میں اتنی گھاس موجود ہے کہ ہر گدھا دونوں وقت آسانی سے اپنا پیٹ بھر سکتا ہے۔ مگر تم اپنا لالچ تو بڑھاتے جاتے ہو، اور گدھوں کی بھوک کم کرنا چاہتے ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

"شٹ اپ" اس نے میری پسلیوں میں زور سے ایک ٹھوکر ماری اور غصے میں بھرا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے سنجیدگی سے غور کیا اس امر پر کہ اس جنونی ڈاکٹر اور سائنس داں سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ ورنہ یہ پگلا تو اپنے تجربے کرتا جائے گا اور میں بھوک سے مر جاؤں گا۔ آخر سوچ سوچ کر میں نے ایک ترکیب ڈھونڈ نکالی۔ اور جب مجھے وہ ترکیب سوجھ گئی تو میں بے حد خوش ہوا، اور بے حد پریشان بھی ہوا۔ خوش اس لیے ہوا کہ چلو اب اپنی جان بچ جائے گی۔ اور پریشان اپنی حماقت پر اس لیے ہوا کہ میں بھی کیسا گدھا ہوں، اب تک اتنی اچھی ترکیب مجھے کیوں نہیں سوجھی تھی۔؟

دوسرے دن ہی میں نے اپنی تجویز پر عمل کرنا شروع کیا ـــ جب دوسرے دن

ماسٹر نے آ کے حسبِ معمول مجھ سے بھوک کے بارے میں سوال کیا تو میں نے ہنس کر کہا۔

"بھوک؟ بھوک کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے!"

"بھی تم۔ بھوکے نہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہرگز نہیں" میں نے اپنی بھوک کو چھپاتے ہوئے قہقہہ لگا کر کہا "مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے ماسٹر! جیسے میں ایک سو سال تک گھاس کھائے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں۔"

"او گاڈ! اب میں۔ کروڑ پتی۔ ارب پتی۔ اینٹی بھوک سیرم۔"

"ہا ہا ہا" میں زور سے ہنسا "یقین نہ ہو تو گھاس سامنے لا کے رکھ دو۔"

ماسٹر نے میرے سامنے بہت سی گھاس لا کے رکھی۔ میرا جی تو چاہتا تھا کہ گھاس پر بھوکوں کی طرح گر پڑوں، اور ایک ایک تنکا چبا چبا کے کھا جاؤں مگر میں نے مونہہ پھیر لیا، اور گھاس کو ٹھوکر مار کر کہا۔

"ارے یہ تو گھاس ہے" میں نے بے حد اکڑ کر کہا "اگر اس وقت تم میرے سامنے بریانی بھی لا کے رکھو تو اسے بھی نہ چکھوں۔"

"شاباش۔ گریٹ" ماسٹر خوشی سے چلّایا۔ اور میرے گلے میں باہیں ڈال کر مجھ سے بغل گیر ہونے لگا۔

میری جان! میری جان! آنا میری جان سنڈے کے سنڈے" میں نے گانا شروع کیا۔ "ماسٹر! آج میرا جی گانے کو بھی چاہ رہا ہے۔ جانے تم نے کیسی دوا مجھے دی ہے ایک تو بھوک نہیں لگی۔ اُوپر سے گانے کو جی چاہ رہا ہے۔ فاقوں سے آگے جہاں اور بھی ہیں، ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔"

"ہرے۔" ماسٹر نے میری زنجیر کھونٹے سے کھول کر اپنے ہاتھ میں لے لی اور مجھے کمرے سے باہر لے جاتے ہوئے کہنے لگا "لالہ... لولا۔ کم ہیر۔ دیکھو دیکھو ڈنکی گاتا۔ بھوکا ڈنکی گاتا!"

ماسٹر مجھے اپنی تجربہ گاہ سے نکال کر بنگلے کے باہر لان پہ لے آیا۔ اور چلا چلا کر کولا سے کہنے لگا۔ "دیکھو کولا۔ ورلڈ پرابلم ختم۔ دیکھو گدھا روٹی نہ ملتا۔ پھر بھی گاتا۔"

میں نے ناچ ناچ کر نیا گانا شروع کیا ۔

جس کھیت سے میتر ہو کسی گدھے کو روٹی

اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کولا اور ماسٹر دونوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں ۔ کولا ماسٹر کے گلے لگ گئی ۔ اور ماسٹر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بولا ۔ "اب ہم ۔ دونوں جاتا ۔ دُنیا گھومتا ۔"

یکا یک میں نے موقع دیکھ کر زور کی ایک دولتی جھاڑی ۔ ماسٹر کے ہاتھ سے زنجیر نکل گئی ۔ اور میں بگٹٹ بنگلے کے دروازے کے باہر بھاگا ۔

"کہاں ؟ کہاں ؟" ماسٹر حیرت سے بولا ۔

میں نے کہا " اب ہم بھی باہر جاتا ۔ دُنیا کی سیر کرتا ۔ گڈ بائی "

"سوائین" ماسٹر غصے سے چیخا ۔

"نو ، ڈنکی " میں نے کہا ۔ اور اپنی جان بچانے کے لیے تیزی سے بھاگا ۔

ماسٹر کولا کو لے کر اس کی نئی موٹر کی طرف بھاگا ۔ اور اس کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر بولا ۔ "جلدی کرو ۔ گدھا پکڑو ..." میں اپنی جان بچانے کے لیے تیزی سے بھاگا ۔ مگر ان دنوں جیسی تیزی اور پھرتی مجھ میں موجود نہ تھی ۔ دس دن کا بھوکا گدھا کہاں تک دوڑے گا ۔ میں سڑک کا موڑ کاٹ کر ایک چھوٹے سے بازار میں گھوم گیا ۔ بازار سے ایک لین میں گھس گیا ۔ لین میں گھس گیا ۔ لین میں گھس کر ایک گلی میں گھوم گیا ۔ گلی اندر سے بند تھی ۔ میں دوڑتا ہوا گلی کے آخر تک چلا گیا ۔ جہاں ایک نئی پانچ منزلہ بلڈنگ کھڑی تھی ۔ یہاں پہنچ کر میں بے بس ہو گیا ۔ اور مجبور ہو کر کھڑا ہو گیا ۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ماسٹر کی موٹر چلی آ رہی تھی ۔ پیچھے جا نہیں سکتا ۔ آگے جاؤں تو کہاں جاؤں ؟ ۔

ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا ۔ اور پھر کچھ سوچے بغیر بلڈنگ کی سیڑھیاں

چڑھ کر دوڑتا ہوا اندر ایک بڑے اور کشادہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا۔
مجھے دیکھتے ہی ایک دھوتی پوش آدمی زور سے چلایا۔
"گوروجی .... گوروجی آگئے۔" وہ دھوتی پوش دوڑتا ہوا آگے بڑھا اور آگے آکر میرے پاؤں پر گر کر خوشی سے رونے لگا۔ "گوروجی ..... آپ کہاں چلے گئے تھے .... میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ آپ کدھر الوپ ہوگئے تھے۔ دھنیہ بھاگ میرے .... اے کورمایا .... بجوریا، واموریا .... کہاں مر گئے سب۔ جلدی سے میم جی کو بلاؤ ..... "
میرے پاؤں چھو کر جب وہ اٹھا اور نوکروں کو بلانے لگا تب میں نے اسے پہچانا۔ وہ سیٹھ بھسوڑی مل تھا جس نے ماہم میں مجھ سے سٹے کا نمبر پوچھا تھا۔ سیٹھ بھسوڑی مل مجھے دیکھ کر خوشی سے ہاتھ نچاتا ہوا بولا۔
"اس دن یوگی راج آپ نے جو نمبر دیا اس سے میں نے سٹے میں تین لاکھ کما لیے۔ یہ بلڈنگ اسی رقم سے کھڑی کی ہے، بھسوڑی محل۔"
"بھسوڑی محل۔" میں ابھی کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ اتنے میں کولا اور ماسٹر جلدی سے آدھمکے اور میری زنجیر پکڑنے لگے۔
"خبردار، جو گوروجی کو ہاتھ لگایا۔" سیٹھ بھسوڑی مل نے ماسٹر کو پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔
"یہ گدھا میرا ہے۔" ماسٹر زور سے چلایا۔
"خبردار، جوان کو گدھا کہا۔" بھسوڑی مل غصے سے بولا۔ "میں نہیں جانتا، تم کون ہو، اور تم نہیں جانتے یہ گدھا کون ہے ... اور کون نہیں جانتا کہ یوگی راج دھیانی گیانی کیسا کیا بہروپ بھرتے ہیں۔"
کولا نے بیچ میں پڑ کر صلح صفائی کی کوشش کرنا چاہی۔ کیوں کہ ماسٹر شارٹ ہینڈ میں بات کرتا تھا اور بھسوڑی مل لانگ ہینڈ میں۔ آخر بھسوڑی مل نے مشورہ دیا۔
"تو تم اپنے گدھے کو بیچ دو۔ میں پانچ سو دوں گا۔"
"نہیں۔" ماسٹر نے انکار میں سر ہلا دیا۔
"ایک ہزار۔"

"نہیں"

"دس ہزار" بھسوڑی مل نے چلا کر کہا۔ ماسٹر حیرت میں رہ گیا۔ اور میری طرف پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگا کہ اس گدھے میں آخر کیا بات ہے جس کے لیے اسے دس ہزار پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں لالچ کی ایک تیز چمک پیدا ہوئی۔ مگر اس نے پھر بڑی سختی سے کہا۔

"نہیں"

"بیس ہزار"

"نہیں"

"تیس ہزار؟"

"نہیں"

"چالیس ہزار۔ پچاس ہزار.... ساٹھ ہزار.... ستر ہزار" بھسوڑی مل بولتا چلا گیا۔

کولا نے جھنجھلا کر ماسٹر کی طرف دیکھا۔ ماسٹر نے زور سے سر ہلایا۔

"نہیں"

"ایک لاکھ" بھسوڑی مل زور سے چیخا۔

"ڈن" (DONE) کولا زور سے جواب میں چیخی اور پھر ماسٹر کی طرف دیکھ کر اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ "پچاس ساٹھ روپے کے حساب سے جتنے گدھے چاہو مل جاتے ہیں۔ اس گدھے کے لیے ایک لاکھ مل رہا ہے۔ لے لو، ورنہ پھر ایسا موقع کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔ تم یقیناً اس رقم سے ایک گدھے کے بجائے گھوڑوں کا اصطبل ضرور خرید سکتے ہو۔"

ماسٹر کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ وہ کبھی میری طرف غور سے دیکھتا کبھی سیٹھ بھسوڑی مل کی طرف دیکھتا۔ اس گدھے کے ایک لاکھ روپے؟ کیا بات ہے اس گدھے میں جو وہ اس عرصے میں دریافت نہ کر سکا؟ ایک لاکھ روپے ایک گدھے کے؟۔

"ایک لاکھ پچیس ہزار" سیٹھ بھسوڑی مل نے چیک لکھ کر ماسٹر نے سامنے رکھ دیا۔

"نہیں" ماسٹر نے کہا۔

"تو لے جاؤ اپنے گدھے کو" بھسوڑی مل نے چیک تہہ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"میں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔"
یہ کہہ کر بھسوڑی مل نے میری زنجیر ماسٹر کے حوالے کر دی۔ ماسٹر مجھے لے کر دروازے کی طرف چلا، مگر دروازے پر پہنچ کر تیزی سے پلٹا اور بھسوڑی مل کے ہاتھ سے چیک لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اور خاموشی سے میری زنجیر بھسوڑی مل کے حوالے کر دی اور کولا کو لے کر تیزی سے باہر نکل گیا۔
جب وہ نظروں سے غائب ہو گیا تو سیٹھ بھسوڑی مل زور سے ہنسا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔
"بڑا بزنس مین بنتا ہے۔ آپ کے لیے تو میں دو لاکھ تک دینے کو تیار تھا مگر وہ تو سوا لاکھ ہی میں راضی ہو گیا۔ احمق۔"
مگر میرے خیال میں تو تم احمق ہو۔ میں نے کہا۔
اس نے سر جھکا کر کہا۔
"آپ جو بولیں ٹھیک ہے۔ میں آپ کو کیا بول سکتا ہوں۔ ارے کوڑیا، مجوریا، داموریا۔ میرا مونہہ کیا دیکھتے ہو۔ ساتھ والا کمرہ اور باتھ روم گورو جی کے لیے صاف کرو۔ یہ آج سے ہمارے ہاں رہیں گے۔"
دوسرے دن سیٹھ بھسوڑی مل میرے کمرے میں بہت سے اخبار لیے داخل ہوا۔ اکثر اخباروں کے پہلے ہی صفحے پر جلی حروف میں یہ خبر چھاپی گئی تھی۔

دُنیا کا سب سے قیمتی گدھا

سیٹھ بھسوڑی مل نے ایک لاکھ پچیس ہزار روپے میں خریدا!

اکثر اخباروں نے میری سوانح حیات کے خاص خاص واقعات شائع کیے تھے۔ مشہور سائنس داں ایچ بی ماسٹر کا انٹرویو تھا جس میں ان کے سائنٹیفک تجربوں کا ذکر تھا، جو انھوں نے مجھ پر کیے تھے۔ مجھے بھو کا سکھنے کا کہیں ذکر نہ تھا۔ پھر سیٹھ بھسوڑی مل کا انٹرویو تھا

جس میں انھوں نے بتایا تھا کہ یہ گدھا میرے لیے بے حد لکی ثابت ہوا۔ اس لیے میں نے اسے ایک لاکھ پچیس ہزار کے عوض خرید لیا ہے۔

اس پر جرنلسٹوں کی طرح طرح کی چہ میگوئیاں تھیں۔ اکثر اخباروں کا پہلے صفحے کا آدھے سے زیادہ حصہ میری خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑے وزیروں کی تقریریں اور سیاسی ہنگامے پس پشت ڈال دیئے گئے تھے۔

سیٹھ بھسوڑی مل خوش ہو کر بولا ۔۔۔ "دیکھا کیسی شاندار پبلسٹی کی ہے تمھاری۔"

میں نے کہا۔ "میرے ساتھ آپ لوگوں کی بھی تو کافی پبلسٹی ہو گئی ہے۔"

وہ بولا۔ "آج کل پبلسٹی کا زمانہ ہے۔ اگر ایک گدھے کے ساتھ بھی پبلسٹی ملے تو یار لوگ اسے حاصل کرنے سے نہیں چوکتے۔ اس لیے میں نے کل رات ہی چند جرنلسٹ دوستوں کو بلا کر انھیں یہ خبر بھیج دی تھی۔"

میں نے اخبار تہہ کر کے الگ رکھ دیا اور سیٹھ بھسوڑی مل سے سوال کیا۔

"آخر آپ کو ایک گدھے کے لیے سوا لاکھ روپے خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ سوال مجھے رات سے پریشان کر رہا ہے۔"

سیٹھ بھسوڑی مل مسکرا کر بولے۔ "جو تمھیں گدھا سمجھتے ہیں وہ خود گدھے ہیں۔ میرے لیے تم کیا ہو، یہ میں ہی خوب جانتا ہوں مگر اس وقت ہم اس سوال پر بحث نہ کریں تو اچھا ہے۔ سب سے پہلے تو مجھے آپ کی صحت کی فکر ہے۔ اس قدر کمزور ہو گئے ہیں آپ ۔۔۔ اب آپ بارہ پندرہ روز تک مکمل آرام کریں۔ بعد میں بات کروں گا۔"

چنانچہ پندرہ دن بڑے عیش و آرام میں گزرے۔ دن میں تین وقت عمدہ سے عمدہ گھاس کھانے کو ملی۔ اور ولایتی جو کا دلیہ، اور گلوکوز کے انجکشن، اور تازہ پھلوں کا رس، اور وٹامن کی گولیاں، اور دیگر مقویات اور دوائیں ایک ماہر وٹرنری ڈاکٹر کی نگرانی میں مجھے کھلائی گئیں۔ پڑھنے کے لیے اگاتھا کرسٹی کے ناول، جاسوسی اور رومانی رسالے، فلمی میگزین۔ اور وہ مغربی رسالے بہم پہنچائے گئے جو صرف آرٹ پیپر پر شائع ہوتے ہیں، اور جن میں یا تو عورتوں کی ننگی تصویریں ہوتی ہیں، یا مشہور مجرموں کے قتل و غارت گری کے لرزہ خیز حالات درج

ہوتے ہیں۔

پندرہ دن کے بعد جب ڈاکٹروں نے مجھے صحت یاب قرار دیا تو سیٹھ نے میرے غسل صحت کے سلسلے میں ایک شان دار پارٹی دی۔ پارٹی انواع و اقسام کے کھانوں کے اعتبار سے بے حد شاندار تھی۔ سیٹھ نے میرے لیے خاص طور پر ہوائی جہاز سے کشمیر سے گھاس منگائی تھی، جو گل مرگ کی اونچی وادیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اور جو ذائقے اور قوت بخش ہونے کے اعتبار سے دُنیا بھر میں بے نظیر سمجھی جاتی ہے۔

مگر اس پارٹی میں سیٹھ نے زیادہ آدمیوں کو دعوت نہ دی تھی۔ صرف سیٹھ تھا اور اس کا دوست جمن، جو ماہم میں سیٹھ کے ساتھ تھا۔ دو آدمی اور تھے جن کے نام مجھے گلاب سنگھ اور شتاب سنگھ بتائے گئے تھے جو اپنے چوڑے چکلے سینے، گھٹے ہوئے سر اور خشونت آمیز مونچھوں کے اعتبار سے بڑے خوفناک غنڈے قسم کے لوگ نظر آتے تھے۔

اس روز میں نے طرح طرح کی شرابیں چکھیں۔ ایسی شرابیں جو کسی غریب گدھے کی قسمت میں نہیں ہوتیں، جو قیمتی ساڑیوں کی طرح خوشنما کانچ کے دریچوں میں دور ہی دور سے دوکان پر نظر آتی ہیں اور جنھیں آوارہ گدھے سڑک پر سے گزرتے ہوئے بس حسرت دیاس سے دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اٹلی کی کیانٹے، ہنگری کی توکئی، جرمنی کی رائن ہاسن، فرانس کی شاتو بریاں، اسپین کی برگنڈی، اور سکاٹ لینڈ کی بلیک ڈاگ وسکی۔ بلیک ڈاگ یعنی کالا کُتّا مارکہ وسکی۔ اب میں کالا کُتّا تو نہ تھا۔ لیکن ایک کالا گدھا ضرور تھا۔ اس لیے مزے میں آکر بلیک ڈاگ کی تین بوتلیں خالی کر گیا اور نشے میں آکے جھومنے لگا۔ میرے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے اور میں ایک وسیع غالیچے کے فرش پر ہو کر ایلوس پر سلے کی دھن میں راک این رول کا ایک ملا جلا ہندوستانی اور انگریزی گیت گانے لگا۔

جُو جُو جُو

کڑوا کڑوا تھو

میٹھا میٹھا ہپ

یو شٹ اَپ!

یُو یُو یُو
جو جو جو
تو میری جان
میں تیرا جانی
تیرے میرے اوپر
ایک مچھر دانی
سو وہٹ
شٹ اَپ!

یکایک سیٹھ بھسوڑی مل، جمن داد، گلاب سنگھ، اور شباب سنگھ اپنی اپنی جگہ سے اُٹھے اور آ کر میرے پاؤں پڑ گئے۔

"گورو مہاراج دیا کرو۔ سٹے کا نمبر بتا دو۔ اُس دن کی طرح" سیٹھ بھسوڑی مل میرے پاؤں پہ اپنی ناک رگڑتے ہوئے بولا۔

"سائیں لال۔ تیرا بول بالا" جمن بولا "بس ایک نمبر بتا دے"

"ہٹو۔ کیا کرتے ہو؟" میں غصّے سے بولا۔ "میں کوئی یوگی راج یا سائیں نہیں ہوں۔ محض ایک گدھا ہوں"

"ہم جانتے ہیں۔ سب جانتے ہیں۔" وہ سب کے سب ایک دم بول اُٹھے۔

"ارے خاک جانتے ہو" میں نے بھڑک کر کہا۔ "میں کوئی سادھو سنت یوگی فقیر ہوتا تو اس طرح سے شراب پیتا؟"

"گورو مہاراج! ہم جانتے ہیں" بھسوڑی مل میرے پاؤں پہ اپنا ماتھا رگڑ کر بولا "جو اگھوری سادھو ہوتے ہیں۔ یا وام مارگی تانترک ہوتے ہیں وہ ماس، مچھلی، انڈا شراب، سب کھاتے پیتے ہیں۔ جس جنور کا بھیس چاہے بدل لیتے ہیں۔ گورو مہاراج ہم آپ کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ ہمیں سٹے کا نمبر دے دو"

میں نے اپنا پاؤں چھڑانے کی بہت کوشش کی۔ مگر گلاب سنگھ، اور شباب سنگھ نے اس

سختی سے میرے دونوں پچھلے پاؤں پکڑ رکھے تھے کہ میں کسی طرح اپنے پاؤں اُن سے نہ چھڑا سکا۔
بالآخر مجھے کہنا پڑا۔

"میرا پاؤں چھوڑو، مردودو، تو بتاتا ہوں"

ان لوگوں نے فوراً میرے پاؤں چھوڑ دیئے اور میں نے کچھ سوچ کر دو ایک لمحوں کے توقف کے بعد جھوم جھوم کر ناچنا اور گنگنا نا شروع کر دیا پھر وہ لوگ تالی پیٹ پیٹ کر میرے ساتھ ناچنے لگے ــــــ میں نے ایک گیت چھیڑ دیا۔

اونی دیکھی سملہ دیکھا۔
دیکھا میں نے کلو
کلو میں اُلو
اُلو میں چلو
چلو میں پانی
مرگئی چاروں کی نانی
نانی کے بیٹے گیارہ
جو جیتا وہ بھی ہارا

گاتے گاتے میرے موہنہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ اور میں لڑکھڑا کر ایک طرف کو گر گیا۔ اور غش کھا گیا۔ مگر یہ سب کچھ بناوٹی تھا۔ گو ان لوگوں نے اسے بناوٹی نہیں سمجھا۔

جمن نے کہا۔
"سائیں کو حال آگیا ہے"
سیٹھ نے کہا۔
"یوگی انتردھیان ہو گئے"
مگر گلاب سنگھ بولا۔
"نمبر کیا بتایا؟"
"نمبر تو صاف بتایا" جمن بولا۔ "مرگئی چاروں کی نانی۔ کبھی چوکا تو ضرور آئے گا"

گلاب سنگھ نے پوچھا۔ مگر اوپن میں آئے گا یا کلوز میں آئے گا۔ یہ تو کچھ انھوں نے بتایا نہیں ۔"

جمّن بولا۔ "فقیر کبھی صاف صاف نہیں بتاتے۔ مطلب نکالنا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ کلوز میں چوکا آئے گا۔"

"وہ کیسے ؟" شتاب سنگھ نے پوچھا۔

"ذرا غور کرو۔" جمّن سوچتے ہوئے بولا۔ مرگئی چاروں کی نانی۔ اب موت کو آپ اوپن نہیں کہہ سکتے۔ موت تو ایک طرح کا کلوز ہے۔ زندگی اوپن ہوتی ہے۔ موت پر کلوز ہوتی ہے۔ لہٰذا چوکا کلوز پر آئے گا۔ کیوں سیٹھ ؟"

سیٹھ نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں...... وہ یوگی راج نے کہا ہے نا۔ نانی کے بیٹے گیارہ...... وہ مجھے زیادہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ گیارہ زیادہ درست ہے۔"

"مگر کل نمبر تو دس ہوتے ہیں سیٹھ ؟" گلاب سنگھ نے کہا۔

"ہاں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یوگی نے اوپن تو کلوز دیا ہے۔ گیارہ یعنی ایک سے ایک ۔"

"ہاں یہ مجھے ٹھیک لگتا ہے۔" شتاب سنگھ نے کہا۔ اور شتابی سے نمبر لگانے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی جمّن اور گلاب سنگھ بھی رفوچکر ہو گئے۔ اب کمرے میں اکیلا سیٹھ رہ گیا تھا۔ وہ اپنی دُھن میں غلطاں کھڑا کھڑا بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ بھی باہر چلا گیا۔

دوسرے دن نہ چوکا آیا نہ ایک سے ایک۔ بلکہ بندی سے بندی آئی۔ یعنی صفر سے صفر۔ جمّن، گلاب سنگھ اور شتاب سنگھ مونہہ لٹکائے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ مگر سیٹھ

بے حد خوش تھا۔ آج اس نے پھر دو لاکھ روپے کما لیے تھے۔

"مگر کیسے؟" جمن نے حیران ہو کر پوچھا۔

میں خود بھی بہت حیران تھا کہ نہ چوکا آیا نہ ایک سے ایک۔ پھر بھی سیٹھ نے دو لاکھ کیسے کما لیے؟۔

سیٹھ مسکرا کر بولا۔

"تم لوگوں کے جانے کے بعد میں دیر تک غور کرتا رہا۔ ہو نہ ہو یوگی مہاراج اتنی آسانی سے نمبر بتانے والے نہیں ہیں۔ ضرور اس میں کوئی الجھاوا ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ یوگی راج نے سب سے آخر میں جو بات کہی وہی سب سے اہم ہے۔"

"جو جیتا وہی ہارا؟" جمن نے کہا۔

"بالکل وہی۔" سیٹھ بھسوڑی مل نے جواب دیا۔ "اس کا تو صاف مطلب یہ ہے کہ ہار جیت برابر۔ یعنی معاملہ صفر۔ یعنی صفر سے صفر۔ اس لیے میں نے بندی پر داؤں لگا دیا۔"

"کمال ہے۔" میں نے کہا۔ "سیٹھ! تم مجھے کتنا سمجھتے ہو۔"

"ساری عمر آپ لوگوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔" سیٹھ بھسوڑی مل خوش ہو کر بولا۔

جمن نے کہا۔

"تو آج جو نمبر تم بولو گے سیٹھ! سائیں بابا کی بات سن کر جو نمبر تم خوب کر کے سوچو گے، اس پر ہم لگائیں گے۔ مگر ہم سے دھاندلی مت کرو کہ تم تو خود کچھ اور لگاتے ہو اور ہمیں کوئی اور نمبر دے دیتے ہو۔"

"آج تو میں کوئی نمبر بتانے والا ہی نہیں ہوں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"کیوں یوگی راج! مجھ سے کیا قصور ہوا ہے؟" سیٹھ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

میں نے جواب دیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں صرف پورن ماشی کے روز نمبر بتا سکتا ہوں۔ مجھے صرف اسی روز نمبر بتانے کی اجازت ہے؟"

میں نے سوچ لیا تھا کہ آج تو معاملہ کسی طرح ٹل گیا اور اپنا بھرم رہ گیا۔ اب اگر ہر روز میں

نے شراب پی کر بکواس شروع کی تو ایک نہ ایک دن پکڑا جاؤں گا۔ یہاں میں بڑے مزے میں تھا، اگر ایک ماہ اور آرام اور سکون سے بسر ہو جائے تو کیا بُرا ہے۔ اگلی پورن ماشی کو دیکھیں گے۔ اس دن بھی اگر ان لوگوں نے میری بکواس سے اپنے ڈھب کا کوئی نمبر نکال لیا تو پو بارہ، ورنہ دُم دبا کے بھاگ جائیں گے۔ یا یہ لوگ خود ہی ڈنڈے مار کر نکال باہر کر دیں گے۔

گُلاب سنگھ بولا۔

سیٹھ! مہینے میں ایک نمبر بھی اگر ٹھیک سے مل جائے تو سال بھر کی روٹی چل سکتی ہے۔ ایک پگلا باوا میں نے دیکھا تھا۔ یہ تو خیر بولتے بھی ہیں" اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔" وہ مہاراج تو ہمیشہ چپ سادھے رہتے تھے۔ ان کا نمبر بڑی مشکل سے ملتا تھا۔ مگر جب ملتا تھا تو ہمیں نہال کر دیا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ ہر وقت اُن کے گرد پہرے جمائے رہتے تھے"

میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جب وہ چُپ رہتے تھے تو نمبر کیسے بتاتے تھے۔ لکھ کر؟"

"جی نہیں" گلاب سنگھ بولا" بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ بڑی عجب عجب حرکتوں سے نمبر بتاتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے میرے مونہہ پر پان کی پیک پھینک دی۔ میں اسی وقت اُٹھ کر گیا اور پانچا لگا دیا۔ وہی نمبر آیا۔ پھر یک روز انھوں نے میرے اوپر اپنا ڈنڈا کھینچ کر مار دیا۔ میں نے اسی وقت جا کے ایکا لگا دیا۔ ڈنڈا بالکل ایکے کے ہندسے کی طرح ہوتا ہے نا؟ ایکا ہی آگیا۔ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ ایک دن یکا یک بمبئی سے الوپ ہو گئے۔ پھر کبھی نہیں ملے۔ ورنہ میں تو اب تک عمر بھر کی روٹیاں ان کی خدمت کر کے کھری کر لیتا۔"

سیٹھ میرے پاؤں دباتے ہوئے بولا۔

"فکر نہ کرو گلاب سنگھ! اب گورو مہاراج کے قدموں کی خاک سے ہمارا بیڑا پار لگ جائے گا۔ اگلی پورن ماشی تک انتظار کرو۔"

اگلی پورن ماشی کے روز میں نے سیٹھ سے صاف صاف کہہ دیا۔
"ہم آج نمبر نہیں بتائیں گے۔"
"کیوں مہاراج؟"
"مجھ کو آج ہمالیہ سے بلاوا آیا ہے۔ جوگی سدھ ناتھ جو ہمارے گورو ہیں اور جو کیلاش پربت پر دو ہزار سال سے سمادھی لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ ہم سے بہت خفا ہو گئے ہیں۔ ہمیں آج چلا جانا چاہیئے۔"
"کیوں مہاراج؟ آپ کے گورو آپ سے کیوں خفا ہیں؟"
"بیٹا بھسوڑی مل۔" میں نے سیٹھ سے کہا۔ "گورو ہم سے اس لئے خفا ہیں کہ ہم بمبئی آکر اپنے کرتویہ کو بھول گئے ہیں۔ گورو مہاراج نے ہم کو اس لیے بمبئی آنے کی آگیا دی تھی کہ ہم بمبئی آکر گورو جی کے مٹھ کے لیے اکیس لاکھ روپے کا چندہ جمع کر کے لائیں۔ یہاں آکر ہم تیرے پلے پڑ گئے۔ اور تو ہم سے سٹے کا نمبر لیتا ہے، اور ہمارے گورو جی کے مٹھ کے لیے کچھ نہیں کرتا۔"
"آپ حکم کریں مہاراج۔ میں ابھی ایک لاکھ کا چیک کاٹتا ہوں۔"
"ایک لاکھ سے کیا ہوگا، بیٹا بھسوڑی مل۔ ہم کو چاہیے اکیس لاکھ۔ اور ہمارے گورو کا حکم ہے کہ صرف ایک آدمی سے اکیس لاکھ مانگنا۔ اور اگر اس نے نہ دیا تو پھر کسی سے مت مانگنا۔ واپس چلے آنا۔"
"میرے پاس اکیس لاکھ تو نہیں ہے گورو جی ۔۔" سیٹھ بھسوڑی مل پریشان ہو کر بولا۔
"تو ہم کہاں تم سے اکیس لاکھ مانگتے ہیں۔" میں نے اس سے کہا۔ "ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہماری دھیان گیان کی باتوں سے تو جو نمبر نکالے، اور اس سے جو کمائے اس کا آدھا حصہ ہمارے نام سے بنک میں جمع کرتا جائے۔ جب اکیس لاکھ ہو جائے گا تو ہم اسے لے کر ہمالیہ چلے جائیں گے۔"
"مجھے منظور ہے ۔۔ مجھے منظور ہے مہرشی ۔۔" سیٹھ بڑی لجاجت سے بولا۔ "آپ جو

فرمائیں مجھے منظور ہے۔ میں تو آپ کے نمبروں کا، میرا مطلب ہے آپ کے چرنوں کا داس ہوں۔"

مقررہ وقت پر پھر محفل جمی۔ پھر وسکی کا دور چلا۔ آج میں نے اچھی طرح سوچ یا تھا کہ ایسی انٹ شنٹ بانکوں گا کہ کسی کے پلے کچھ نہ پڑے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ لوگ کوئی نمبر نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو میرا آدھا حصّہ تو کھرا ہے۔ ورنہ وہ لوگ مجھ پر کسی قسم کا الزام نہ دھر سکیں گے۔ اور اپنا کچھ وقت اور مزے میں کٹ جائے گا۔ یہ دُنیا ہے ہی ایسی۔ یہاں پر ایمانداری، سچائی دیانت داری اور آدرش کی بلندی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی بھوکا مرے اور گرھا گرھ کر دوسروں کے لیے گدھ بن کر مر جائے۔ اب تو ان لوگوں کے ساتھ میں بھی ایسا ہی سلوک کروں گا جیسا یہ اب تک مجھ سے کرتے آئے ہیں ان کا جوتا اُن ہی کے سر رہنا چاہیے۔ ورنہ ہمارے ایسے سر پھرے گدھوں کے لیے کہاں جگہ ہے۔؟

لیکن جب نمبر بتلانے کا وقت آیا تو میرے دل میں عجب غصّہ جگہ پانے لگا۔ کیسے احمق اور لالچی ہیں یہ لوگ؟ کتنے جاہل اور پیسے کے بچاری ہیں؟ ان کے لیے مذہب، سیاست سماج، کلچر، تہذیب، انسان کا مستقبل، ایسے الفاظ کوئی معنے ہی نہیں رکھتے۔ یہ لوگ روپے کے محدود دائرے میں گم سے ہوئے، اپنے ضمیر پر پٹی باندھے ہوئے، ماضی، حال اور مستقبل سے بے نیاز اپنی حرص کے کولہو کے گرد گھومتے ہوتے ہیں۔ یہ چاروں کے چاروں کس طرح اپنے چہرے اٹھائے ہوئے میری طرف کیسی حمقانہ التجا سے دیکھ رہے تھے جیسے میرے ایک لفظ سے ان پر چاروں طرف سے نوٹوں کی بارش شروع ہو جائے گی۔

"سؤر کے بچے ـــ حرامی!" میں نے غصّے میں جھنجھلا کر کہا۔ وہ چاروں یک لمحے کے لیے چونک گئے۔ پھر ایسے ٹھس سے بیٹھ گئے جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

"محنت نہیں کریں گے۔ کام نہیں کریں گے۔ دیش کی دولت میں ایک پائی کا اضافہ

نہیں کریں گے۔ مگر سٹہ، جوا، ریس، سمگلنگ، بدمعاشی غنڈہ گردی، آوارگی، جعل سازی، بددیانتی چوری، ڈکیتی، کنبہ پروری رشوت، قتل، ہر بڑے سے بڑے کام کو روا رکھیں گے۔ پھر اس بات پر مگرمچھ کے آنسو بہائیں گے کہ یہ ملک ترقی کیوں نہیں کرتا۔ آگے کیوں نہیں بڑھتا غریبی دور کیوں نہیں ہوتی۔ لوگ خوش حال اور خوش سلیقہ کیوں نظر نہیں آتے؟ —— سالے چور، اُچکے بدمعاش، کُتّے کمینے —— چاہتے ہیں کہ چھو منتر کر کے لاکھوں روپے ایک لمحے میں کمالیں —— نمبر بتادو! نمبر بتادو —— کیوں نمبر بتادوں میں؟ —— نہیں بتاتا —— نہیں بتاتا۔ جاؤ جو کرنا کر لو، میرے ٹھینگے سے۔"

مارے غصّے کے میرے مونہہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ اور میں تھر تھر کانپنے لگا۔ اُن کے منحوس اور لالچی چہرے کیسے بدصورت اور بگڑے ہوئے نظر آرہے تھے —— فق اور جُھکے ہوئے۔ میں نے انتہائی کراہت کے عالم میں ان کی طرف سے مونہہ پھیر لیا اور کمرے سے باہر چلا گیا —— دروازے کی اوٹ لے کر میں ان کی باتیں سننے لگا۔

شتاب سنگھ کہہ رہا تھا۔

"اس گدھے کو ہوا کیا ہے؟ ہمارا کھاتا ہے ہمیں ہی گالی دیتا ہے۔ وسکی یہ پیئے۔ پھلوں کا رس اس کے لیے آئے۔ دو نوکر اس کی مالش اور مٹھی چاپی کریں —— سونے کے لیے عمدہ بستر —— رہنے کے لیے عمدہ کمرہ، جھاڑ فانوس، غالیچے، گاؤ تکیے، ٹیلی فون، زندگی کی ہر نعمت اس کے لیے مہیا ہم کریں اور یہ کم بخت ہم ہی کو گالی دے۔ میں اس کو ابھی پستول مار کر ہلاک کرتا ہوں۔"

"نہیں نہیں۔ تم نہیں سمجھے شتاب سنگھ۔" جمن بولا "سائیں کو جلال آگیا ہے۔ ضرور ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔"

"جمن ٹھیک کہتا ہے۔" گلاب سنگھ نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ "یوگی راج ہم سے خفا ہیں۔ ضرور ہم سے کوئی اپرادھ ہوا ہے۔"

"اجی کچھ نہیں ہوا۔" سیٹھ بھسوڑی مل نے ہنس کر کہا۔ "سادھو کا بچن تو آکاش بانی ہوتا ہے۔ اس کی گالی بھی گلاب ہوتی ہے۔ تم نے غور نہیں کیا۔ مہاتما نے نمبر بتادیا ہے۔"

"نمبر بتا دیا ہے کہ ہم لوگوں کو گالیاں دی ہیں ؟" شتاب سنگھ نے غصّے سے کہا۔
"ہائیں !— نمبر بتا دیا ہے ؟— وہ کیسے ؟— گلاب سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا۔
"ذرا سوچ کر بتاؤ کہ گفت گو شروع کرتے وقت یوگی راج نے ہمیں کون سی گالیاں دی ہیں ؟"
"اجی، اس نے چھوٹتے ہی ہمیں سؤر کا بچّہ اور حرامی کہا، اور آخر میں سالے چور۔ اُچکّے بدمعاش، کُتّے کمینے کہا—" شتاب سنگھ بھڑک کر غصّے سے لال ہوتا گیا۔
"گویا شروع میں یوگی راج نے دو گالیاں دیں، اور آخر میں چھ گالیاں!—" سیٹھ بھسوڑی مل نے خوش ہو کر کہا۔ "بس اب تو معاملہ صاف ہے۔ آج اوپن میں دوا آئے گا اور کلوز میں چھکّا۔ آج مہرشی نے ہمیں جی بھر کر گالیاں دی ہیں — اس لیے جی بھر کے اسی نمبر پر سٹّہ کھیل دو۔ آخری پائی بھی لگا دو یارو۔ دوّے اور چھکّے پر۔ آج موقعہ ہے ساری بمبئی لوٹ لو۔"
ایک لمحے کے لیے ان لوگوں نے حیرت اور تعجب مسکراہٹ کی نگاہوں سے سیٹھ بھسوڑی مل کی طرف دیکھا۔ پھر وہ چاروں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے اور ایک دوسرے کا خوشی سے مونہہ چومنے لگے۔
میں بھاگ کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور ان لوگوں کی فطرت پر غور کرنے لگا جو روپے کی خاطر گالیاں کھا کر بھی بے مزہ نہ ہوئے تھے۔ اتنی بات تو بالکل صاف ہے — میں نے اپنے دل میں سوچا — اگر کل یہ نمبر نہ آئے تو اپنی جان کی خیر نہیں — شتاب سنگھ مجھے فوراً گولی مار دے گا۔ میں نے یہاں سے نکل بھاگنے کے لئے کئی پلان بنائے۔ مگر اس قدر کڑا پہرہ تھا مجھ پر کہ مجھے بھاگنے کی مہلت نہ ملی اور رات کو سوتے وقت میرا کمرہ باہر سے مقفّل کر دیا گیا۔
پھر صبح کے وقت جب کمرہ کھولا گیا تو میں ہراساں اور لرزاں اپنی موت کی توقع میں چُپ چاپ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔
ان چاروں کو اپنے سامنے متین اور سنجیدہ دیکھ کر میری گھگھی بندھ گئی — آج موت آگئی گدھے! اب تیار ہو جا — میں پریشان ہو کر پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ لوگ اتنے ہی آگے بڑھ آئے اور چاروں کے چاروں میرے میرے پاؤں پر گر پڑے۔
دوّے سے چھکّا آگیا تھا۔

جمن نے ستر ہزار کمانے تھے۔ گلاب سنگھ نے تیس ہزار۔ شتاب سنگھ نے پچاس ہزار۔ اور سیٹھ بھسوڑی مل نے اپنی ساری جمع پونجی لگا دی تھی۔ اس نے چونسٹھ لاکھ کما لیے تھے۔

چونسٹھ لاکھ!

ایک داؤ میں چونسٹھ لاکھ!!

باپ رے!!!

اب وہ لوگ خوشی سے ہنستے جاتے تھے، خوشی سے روتے جاتے تھے۔ اور میرے پاؤں پر بوسہ دیتے جاتے تھے۔ اور مسرت اور شادمانی، حیرت اور استعجاب سے ان کے گلے سے عجیب و غریب چیخیں اور کراہیں نکل رہی تھیں اور جو کچھ وہ بول رہے تھے، وہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کبھی چند الفاظ سمجھ میں آجاتے۔ "بھگوان..... مالک..... مہرشی..... دیوتا۔ سائیں..... فقیر، درویش۔"

میں نے کڑک کر کہا۔

"نکل جاؤ۔ ابھی نکل جاؤ کمرے سے۔ ہم تخلیہ چاہتے ہیں۔"

وہ لوگ فوراً میرے پاؤں چھوڑ کر الٹے پاؤں بھاگے۔ ہاتھ جوڑتے ہوئے تھر تھر کانپتے ہوئے کمرے سے جانے لگے۔

میں نے گرج کر پھر کہا۔

"سیٹھ کو یہیں چھوڑ جاؤ۔"

جب سیٹھ اکیلا میرے سامنے کھڑا رہ گیا تو میں نے چند لمحے غور سے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ سیٹھ نے نظریں جھکا لیں۔ اس کے سارے بدن پر رعشہ طاری تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔

"سچ سچ بتاؤ۔ تم نے کتنے کمائے؟"

"چونسٹھ لاکھ گورو دیو۔ صرف چونسٹھ لاکھ۔"

"تو میرے بتیس لاکھ مجھے دے دو۔"

"ابھی لیجئے مالک۔"

سیٹھ بھسوڑی مل گھبرایا ہوا، بھاگا ہوا اپنے بیڈروم میں گیا اور اپنی تجوری کھول کر بتیس ہزار کے بتیس سو نوٹ لے آیا۔ اور نوٹ لاکر اُس نے میرے قدموں پر ڈھیری کر دیئے۔ بتیس لاکھ کے نوٹ دیکھ کر میرا دل پسیجا۔ میرا لہجہ بدلا۔ اور میں نے اس سے کہا۔

"بچّہ! ہم تجھ سے بہت خوش ہیں۔ تو اپنے امتحان میں پورا اترا۔ اس خوشی میں ہم تجھے مزید دو لاکھ کا انعام عطا کرتے ہیں۔ اس ڈھیری میں سے دو لاکھ کے نوٹ اٹھا لے۔ اور باقی تیس لاکھ کے نوٹ لے کر ہمارے ساتھ بینک کو چل۔

❖

جانا گدھے کا
دی گریٹ نیشنل سٹار بنک آف انڈیا میں
اور جمع کرانا تیس لاکھ روپے کا
اور ملاقات کرنا بینک کے جنرل منیجر سے

بینک کے منیجر سے ایک اسسٹنٹ نے کہا۔ "آپ سے ملنے کے لیے ایک گدھا آیا ہے۔"

"گدھا؟۔ گدھے کا بینک میں کیا کام؟ ـــــ" بینک کے منیجر نے چونک کر پوچھا۔

میرے بینک کے اندر آتے ہی سب لوگوں میں کھلبلی مچ گئی تھی ـــ! کلرک لوگ اپنی کرسیوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایڑیاں اُٹھا کر مجھے دیکھنے لگے ـ پیسہ نکلوانے والے اور پیسہ جمع کرانے والے سب مجھے حیرت اور پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ پیشتر اس کے کہ وہ لوگ اپنے حواس یکجا کر کے میرے داخلے پر احتجاج کرتے، سیٹھ بھسوڑی مل مجھے لے کر بینک کے منیجر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ ــ" بینک منیجر چلایا۔ پھر وہ سیٹھ بھسوڑی مل سے مخاطب ہو کر بولا۔
"جناب والا! یہ بینک ہے، اصطبل نہیں ہے۔"

سیٹھ مجسوڑی مل کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے بات نہیں کرنے دی۔ میں نے آہستہ سے مسکرا کر کہا۔

"منیجر صاحب! اس دُنیا میں سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ جن لوگوں کو بینک میں ہونا چاہیئے تھا، وہ اصطبل میں بند کر دیئے جاتے ہیں ـــــ اور جن لوگوں کو واقعی اصطبل میں ہونا چاہیئے تھا وہ بینک میں پائے جاتے ہیں۔"

بینک منیجر مجھے بولتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا نچلا جبڑا لٹکے کا لٹکا رہ گیا۔ ہکلا کر بولا۔

"آ... آپ کی تعریف؟"

"ایک گدھے کی کیا تعریف ہو سکتی ہے؟ وہ بھلا اس لائق کہاں! ـــ مگر میں آپ کا وقت ضائع نہ کروں گا۔ مجھے گدھا کہتے ہیں۔ اور میں آپ کے ہاں اپنا اکاونٹ کھولنے آیا ہوں۔"

"ہمارے ہاں کسی گدھے کا اکاؤنٹ نہیں کھل سکتا۔"

"کیوں نہیں کھل سکتا؟۔ میں نقد روپیہ لایا ہوں۔ آپ کا بینک چارج دینے کو تیار ہوں۔"

"آپ انسان نہیں حیوان ہیں۔"

"اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ کے ہاں جو لوگ آتے ہیں، سب کے سب انسان ہیں۔ میں نے بہت سے انسانوں کو حیوانوں سے بدتر زندگی بسر کرتے دیکھا ہے۔ بینک اکاونٹ رکھنے والے بہت سے ایسے انسانوں کو جانتا ہوں جنھیں دیکھ کر حیوانوں سے محبت ہو جاتی ہے۔"

میں مجبور ہوں صاحب۔ بینک منیجر میری باتوں سے پریشان ہو کر بولا ــــ "یہ ہمارے بینک کا قاعدہ ہے۔ ہم کسی جانور یا حیوان کا اکاؤنٹ نہیں کھول سکتے۔"

"انسان کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ وہ حیوانِ ناطق ہے۔ میں ایک بولنے والا گدھا ہوں۔ اس حد تک آپ مجھے بھی حیوانِ ناطق یعنی انسان سمجھ سکتے ہیں۔"

"بحث مت کیجیے ـــ میں یہاں کسی گدھے کا اکاؤنٹ نہیں کھول سکتا۔" بینک

منیجر نے بڑی سختی سے

میں نے کہا: "بس دو ایک باتیں بتا دیجیے۔ پھر میں چلا جاؤں گا"

"فرمایئے۔"

"یہ جو ہزاروں آدمی آپ کے بینک میں روپیہ جمع کراتے ہیں، ان کو آپ کیا دیتے ہیں؟"

"دینے کا کیا مطلب؟ ہم تو لیتے ہیں۔ بینک کا سود"

"یعنی ایک تو آپ ہمارا پیسہ اپنے پاس رکھیں اور پھر سود بھی ہم ہی سے لیتے ہیں؟"

"نہیں۔ اگر آپ جنرل اکاونٹ کے بجائے سیونگ اکاونٹ یا فکسڈ ڈیپازٹ میں روپیہ رکھوا دیں تو ہم آپ کو سود دیں گے"

"آخر آپ مجھے کیوں سود دیں گے؟ جب میرا روپیہ آپ کے پاس ہمیشہ جمع رہتا ہے تو پھر آپ مجھے کیوں کر سود دے سکتے ہیں؟۔ کیا میرا روپیہ آپ کے پاس پڑا پڑا انڈے دیتا ہے۔؟"

منیجر ہنسا اور بولا۔

"حضور والا۔ قصہ یہ نہیں ہے، وہ بات یہ ہے کہ آپ ایسے ہزاروں لوگ جو اپنا تھوڑا تھوڑا سینکڑوں کا سرمایہ ہمارے بینک میں جمع کراتے ہیں، ان ہی کے سرمائے کو جمع کرو تو لاکھوں کی رقم ہو جاتی ہے۔ پھر ہمارے بینک کے ڈائرکٹر لوگ آپ کے سرمائے کو بڑی بڑی صنعتوں میں لگاتے ہیں ـــ محفوظ جائدادیں خریدتے ہیں، اور لاکھوں کا منافع کماتے ہیں"

یعنی غریب آدمی اپنی مختصر سی پونجی حفاظت کے خیال سے تمہارے جنرل اکاونٹ میں جمع رکھتا ہے۔ اور تم ہم سب کی پونجی جمع کر کے لاکھوں کا دھندا کر لیتے ہو؟"

"جی ہاں بات تو کچھ ایسی ہی ہے"

"اور پھر تم کہتے ہو ـــ اس بینک میں کسی گدھے کا اکاونٹ نہیں کھل سکتا؟"

بینک منیجر میری بات سمجھ کر ہنس دیا۔ "بولا۔ "آپ بے حد تم ظریف واقع ہوئے ہیں"

"غریب آدمی کبھی کبھی اپنی مصیبت کو ظرافت سے نہ ٹالے تو جینا محال ہو جائے۔ اچھا منیجر صاحب، اب ہم جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں بینک منیجر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

میرے جانے کے بعد سیٹھ بھسوڑی مل نے بینک منیجر سے کہا۔

"تم نے سخت غلطی کی دیالو رام! یہ گدھا تیس لاکھ روپے جمع کرانے آیا تھا۔"

"تیس لاکھ؟" بینک منیجر زور سے چلایا۔

"ہاں تیس لاکھ۔" سیٹھ نے سر ہلا کر کہا۔

"تیس لاکھ!" بینک منیجر کرسی سے اُچھل کر دروازے کی طرف دوڑا۔ "ارے وہ گدھا کہاں ہے؟"

بینک میں ایک دم کھلبلی مچ گئی۔ سب لوگ منیجر کو بینک سے بھاگ کر باہر نکلتے ہوئے، میرے پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ بینک منیجر چیخ رہا تھا۔

"ابے، او گدھے! یعنی کہ اجی جناب گدھے صاحب! ذرا سُنیئے تو سرکار میری..."

میں نے پیچھے مڑ کر پوچھا۔

"کیا ہے؟"

بینک منیجر نے میری رسّی پکڑی اور بڑی لجاجت سے بولا۔

"مجھ سے بڑی غلطی ہوئی جناب۔ اب آپ اندر چلیے اور اپنا روپیہ جمع کرا دیجیے۔"

"مگر میں تو ایک گدھا ہوں۔"

"اجی آپ گدھے کیا اُلّو ہوں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" منیجر نے میری رسّی کھینچتے ہوئے کہا۔

"میں ایک حیوان ہوں۔"

"اجی آپ حیوان کیا شیطان ہوں تب بھی میں آپ کو نہ جانے دوں گا۔ چلیے.... اندر چلیے...."

بینک کا منیجر فرشی سلام کرتا ہوا مجھے اپنے کمرے کے اندر لے گیا۔ لوگ حیرت سے ہکّا بکّا رہ گئے۔ اندر جاتے ہی بینک کے منیجر نے زور سے گھنٹی بجائی۔

"اکاؤنٹ کا فارم لاؤ.... دستخطی فارم لاؤ.... پاس بک لاؤ.... چیک بک لاؤ.... جلدی کرو" پھر مڑ کر مجھ سے مخاطب ہوا "آپ تیس لاکھ روپیہ جمع کرائیں گے؟"

"جی ہاں"

"ہم" بینک منیجر نے خوشی سے اپنی ہتھیلیاں رگڑیں۔ پھر بولا "میرے خیال میں آپ بیس لاکھ تو فکسڈ ڈیپازٹ میں دیجیے۔ پانچ لاکھ سیونگ اکاؤنٹ میں۔ اور پانچ لاکھ جنرل اکاؤنٹ میں"

"جی نہیں" میں نے کہا "میں اکیس لاکھ روپے فکسڈ ڈیپازٹ میں رکھوں گا چار لاکھ سیونگ میں اور پانچ لاکھ جنرل اکاؤنٹ میں"

"بیس کے بجائے اکیس لاکھ کیوں؟" بھسوڑی مل نے پوچھا۔

"اکیس لاکھ روپے مٹھ کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں" میں نے سیٹھ بھسوڑی مل کو بتایا۔ وہ بھول گئے تھے کہ گورو جی نے مجھے ہمالیہ میں مٹھ کھولنے کے لیے کہا تھا۔

سیٹھ بھسوڑی مل کو یاد آگیا۔ اور اسے اطمینان ہوگیا۔

منیجر نے ایک فارم میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"اس پر دستخط کر دیجیے"

میں نے کہا۔

"میں دستخط نہیں کر سکتا۔ میں تو گدھا ہوں"

"کوئی بات نہیں" منیجر بولا "آپ انگوٹھا لگا دیجیے"

"گدھے کا انگوٹھا بھی نہیں ہوتا۔ سُم ہوتا ہے"

"سُم بھی چلے گا ـــ تیس لاکھ کی رقم کے لیے سُم تو کیا، گدھے کی دُم کا نشان بھی چلے گا"

بینک منیجر مسکرا کر بولا ـــ اور اس نے فارم میرے سامنے رکھ دیے۔ "سُم لگائیے"

سیٹھ بھسوڑی مل نے کہا۔ "ٹھہر جاؤ"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

سیٹھ بھسوڑی مل نے منیجر سے پوچھا۔ "اس رقم پر آپ کو اوور ڈرافٹ کیا ملے گا؟"

"ایک لاکھ کا نہیں دو لاکھ کا" سیٹھ بولا۔

"چلیے دو لاکھ سہی" منیجر نے کہا۔ "آپ سم لگایئے"

جب میں فارموں پر سم لگا رہا تھا اُس وقت ایک دُبلا پتلا پریشان حال آدمی اندر آیا اور بینک منیجر سے کہنے لگا۔

"میری بیوی سخت بیمار ہے۔ جانے بچے گی کہ نہیں بچے گی؟ — مجھے اس کی دوا دارو کے لیے ڈیڑھ سو روپے چاہئیں اور میرے اکاؤنٹ میں صرف پچاس روپے جمع ہیں۔ اس وقت منیجر صاحب مجھے ایک سو اوور ڈرافٹ دے دیجیے دو دن کے بعد پہلی تاریخ کو جب مجھے تنخواہ ملے گی، میں ایک سو روپے بینک میں جمع کرا دوں گا"

"آپ کا اوور ڈرافٹ بینک سے منظور ہے"؟ منیجر نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ مگر میری بیوی سخت بیمار ہے۔ وہ مر جائے گی اگر....."

منیجر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "سوری، میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا"

وہ آدمی روتا ہوا باہر چلا گیا۔

میں نے منیجر سے کہا۔ "تیس لاکھ جمع کرانے والے گدھے کو دو لاکھ کا اوور ڈرافٹ! اور کسی کی بیوی بستر مرگ پر پڑی ہوئی ہے سو روپے بھی نہ ملیں۔ منیجر صاحب! آپ اپنے بینک کو انسانوں کا بینک کہتے ہیں؟"

بینک کا منیجر کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اتنے میں دروازہ پھر کھلا اور ایک لمبے بالوں والا گورے رنگ کا آدمی اندر آیا۔ اس نے بادامی رنگ کی سلک کی قمیض پہن رکھی تھی اور ایک سفید پتلون اور پشاوری چپل، اس کے ہاتھ میں ایک چیک تھا۔ وہ بولا۔ "کٹاکٹ فلم کمپنی والوں نے مجھے ڈیڑھ سو کا یہ چیک دیا تھا۔ مگر کلرک بولتا ہے۔ کٹاکٹ فلم کمپنی کے حساب میں صرف ایک سو چالیس روپے جمع ہیں"

"تو میں کیا کروں؟" منیجر نے تنک کر پوچھا۔

"آپ ایسا کیجیے کہ میں کٹاکٹ فلم کمپنی کے حساب میں دس روپے اپنے پاس سے جمع کرائے دیتا ہوں۔ آپ فٹافٹ میرا ڈیڑھ سو کا چیک پاس کر دیجیے سالا اپنے دس روپے

ہی کا تو وعدہ رہے گا۔ ایک سوچا لیں تو اپنے گھر میں آئے گا۔"

"او کے" منیجر نے کہا اور لمبے بالوں والا آدمی فوراً باہر چلا گیا۔

"یہ کون تھا؟" میں نے اس آدمی کی چالاکی سے متاثر ہو کر بینک منیجر سے پوچھا۔

"یہ دادا دھمال ہے۔ کٹا کٹ فلم کمپنی میں ڈائرکٹر ہے۔" پھر وہ مجھے پاس بک اور چیک بک دیتے ہوئے بولا۔ "لیجیے صاحب! آپ کا کام ہو گیا میرے لیے کوئی اور خدمت؟"

میں نے چیک بک دیکھ کر کہا۔ "کیا اب میں اس اکاؤنٹ سے روپیہ نکال سکتا ہوں؟"

"جتنا جی چاہے نکال سکتے ہیں۔" منیجر بولا۔

"اور چیک بک پر دستخط کے بجائے اپنا سُم لگا سکتا ہوں؟"

"بے شک۔ آپ کے سُم کا نشان ہی آپ کا دستخط سمجھا جائے گا۔"

"بہت خوب!" میں نے سیٹھ بھوسوڑی مل سے کہا۔ "اب آپ اس چیک پر ایک لاکھ کی رقم لکھ دیں۔ میں اپنا سُم لگا دیتا ہوں۔"

ایک لاکھ روپے لے کر ہم باہر آ گئے۔ باہر آ کر سیٹھ نے مجھ سے پوچھا۔

"گدھو! اس رقم کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے کہا۔ "زیادہ بکواس نہ کرو۔ یہاں سے سیدھے نکڑ کے جنرل سٹور پر چلے جاؤ۔ اور رقم کے لیے ایک جھولا خرید لاؤ۔ اور اسے میری گردن میں لٹکا کے اس میں یہ ایک لاکھ روپیہ رکھ دو۔"

سیٹھ بڑبڑاتا ہوا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ "ابھی سے اس گدھے کے مزاج میں گرمی آ گئی ہے۔" اس کا خیال تھا کہ میں نے سنا نہیں۔ لیکن میں نے سن لیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "خیر تجھے بھی ٹھیک کر دوں گا۔"

جب سیٹھ نکڑ پر غائب ہو گیا تو میرے کانوں میں آواز آئی "سیٹھ۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے کہیں سیٹھ دکھائی نہ دیا۔

پھر کانوں میں آواز آئی "سیٹھ! میں تم سے مخاطب ہوں۔"

اب جو میں نے دیکھا تو دادا دھمال تھا، کہہ رہا تھا۔
"سیٹھ! آئس کریم کھائے گا؟"
"نہیں۔"
"جلیبی؟"
"نہیں۔"
"عمدہ مگھئی پان کھائے گا فسٹ کلاس۔"
"نہیں۔" میں نے انکار میں سر ہلا کے کہا۔ "کیا؟ بات کیا ہے؟ کیوں خوشامد کر رہے ہو؟"
"خوشامد تو ہم اپنے باپ کی بھی نہیں کرتے گا۔ مگر تم کو ایک کام کی بات ضرور بتائے گا۔ ذرا ادھر کونے میں آجاؤ۔"

میں اس کے قریب چلا گیا۔ وہ دس منٹ تک میرے کان میں کھسر پھسر کرتا رہا۔ اور ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ جب اس نے دور سے سیٹھ بھسوڑی مل کو آتے دیکھا تو فوراً "پھر ملوں گا" کہہ کر غائب ہو گیا۔ سیٹھ بھسوڑی مل نے نہ اُسے مجھ سے باتیں کرتے دیکھا، نہ غائب ہوتے دیکھا۔ میرے قریب آکر سیٹھ بھسوڑی مل نے جھولا میرے گلے میں باندھا۔ اس میں ایک لاکھ کے نوٹ گن کر ڈالے۔ میرے پاؤں چھوئے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔
"گورو مہاراج! اب آپ ہمالیہ کب جائیں گے؟"
ایک لاکھ کے نوٹ جھولے میں پڑتے ہی میرے سارے جسم میں ایک عجیب سنسنی سی دوڑ گئی۔ رگوں میں دوران خون تیز ہو گیا۔ سر سے پاؤں تک ایک انگڑائی سی آئی۔ پھر میں نے زور کی ایک ہانک لگائی اور کہا۔
"احمق! اب ہم ہمالیہ نہیں جائیں گے۔ یہیں بمبئی میں رہیں گے۔"
"اور وہ — وہ گدھوں کا مٹھ؟" سیٹھ نے پوچھا۔
"وہ گدھوں کا مٹھ اب بمبئی میں ہی کھلے گا۔"
"یعنی؟" سیٹھ نے میری طرف حیرت سے دیکھ کر پوچھا۔
"یعنی ایک فلم کمپنی۔"

٭٭

بنا گدھے کا فلم پروڈیوسر اور ایکٹر
اور عشق کرنا
فلم سٹار پریم بالا سے

"فلم کمپنی ؟؟" سیٹھ بھسوڑی مل زور سے چیخا۔ "گورو جی، آپ تباہ ہو جائیں گے برباد ہو جائیں گے۔"

"ہم نہ تباہ ہوں گے، نہ برباد ہوں گے۔ ہمیں دادا دھمال نے سب بتا دیا ہے۔ صرف اڑتالیس روپے میں فلم کمپنی کھل سکتی ہے۔"

"صرف اڑتالیس روپے میں ؟۔ مہاراج آپ کی عقل کو کیا ہوا ہے ؟"

"ہم کوئی گدھے نہیں ہیں سیٹھ۔ ہم سب سمجھتے ہیں۔ دادا دھمال نے ہمیں سب سمجھا دیا ہے۔ وہ کہتا تھا مجھے صرف اڑتالیس روپے دے دو۔ میں تمہیں فلم کمپنی کھڑی کر کے دکھا دوں گا۔ میں نے اُسے سو روپیہ دے دیا ہے۔ اب وہ کل تک فلم کمپنی کھڑی کر کے میرے پاس آئے گا۔"

"فلم کمپنی نہ ہوئی بانس کا ڈنڈا ہو گیا۔ اُٹھایا اور کھڑا کر دیا۔" سیٹھ بھسوڑی مل نے شدید بیزاری کے عالم میں کہا۔

"تم نہیں سمجھتے ہو۔ ہم سب سمجھتے ہیں۔ دادا دھمال نے ہمیں سب سمجھا دیا ہے۔ اور پھر ہمارے پاس سے جائے گا کیا؟ صرف اڑتالیس روپے اور اڑتالیس روپے پر اگر اڑتالیس لاکھ کا منافع ہو تو کیا تم اس کو برا دھندہ کہو گے؟"

"مگر اتنا منافع ہو گا کہاں سے۔؟"

"ہم سب جانتے ہیں، ہم سب سمجھتے ہیں۔ تم کو بھی سمجھا دیں گے۔ تم کو بھی بتا دیں گے۔ کل دادا دھمال ہمارے پاس آئے گا۔ اس سے مل کر تم اپنی تسلی کر لینا!"

دوسرے دن دادا دھمال اپنے بزنس منیجر چمن کو لے کر ہمارے گھر آ گیا۔ چمن دادا دھمال سے بھی زیادہ سوکھا اور دبلا پتلا نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں بڑی تیزی سے ادھر اُدھر حرکت کرتی تھیں۔ اور ان میں ایک مستقل بھوک کی چمک تھی۔ مگر وہ بڑی ذہین اور طرار آنکھیں تھیں۔ ایسی آنکھیں جو نگاہوں سے انگلیوں کا کام لیتی معلوم ہوتی تھیں۔

سیٹھ بھسوڑی مل نے پوچھا۔ "اڑتالیس روپے میں پکچر کیسے بن سکتی ہے اور اس سے اڑتالیس لاکھ کا فائدہ کیسے ہو سکتا ہے؟" دادا دھمال نے ایک پیکٹ کھولا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ آپ کی فلم کمپنی کے لیٹر پیڈ۔ اگریمنٹ فارم اور رسید بکیں ہیں۔ میرے بزنس منیجر چمن نے انھیں راتوں رات پریس میں دے کر چھپوا لیا ہے۔"

"دو سو روپے تو شاید انہی کاغذوں کے ہو جائیں گے۔" سیٹھ بھسوڑی مل نے اعتراض کیا۔

"اپنی جیب سے ایک دھیلا نہیں جائے گا۔" چمن نے بتایا۔ "میں نے پریس والے سے کنٹریکٹ کر لیا ہے کہ ہماری پکچر کی پوری پبلسٹی اس کے ہاں چھپے گی۔ بڑے بڑے رنگین پوسٹر بھی وہی شائع کرے گا۔ پچیس ہزار روپے خرچ ہوں گے۔"

"مگر تم تو اڑتالیس روپے ....." میں نے کہنا چاہا۔ مگر مجھے ٹمن نے بیچ میں ہی ٹوک کر کہا۔

"پہلے پوری بات سن لو سیٹھ، پھر اعتراض کرو۔ وہ پچیس ہزار روپے ہمیں نہیں دینا ہوگا۔ اپنی جیب سے ایک دھیلا نہیں جائے گا۔ یہ رقم ڈسٹری بیوٹر دے گا۔"

"یہ ڈسٹری بیوٹر کون ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمھاری طرح سیٹھ لوگ ہوتا ہے۔" ٹمن بولا۔ "جو پکچر ہم سے خریدتا ہے وہی پچیس ہزار دے کر پبلسٹی کی ڈلیوری لے لے گا۔"

"مگر مال کے بغیر پکچر کیسے بن جائے گی؟" سیٹھ بھسوڑی مل نے پوچھا۔ "پکچر میں تو بڑے بڑے سٹار لوگ کام کرتے ہیں، جو سنا ہے ایک پکچر میں کام کرنے کے لیے لاکھوں روپے وصول کر لیتے ہیں۔ تم اڑتالیس روپے میں پکچر کیسے بناؤ گے؟"

"بہت آسان کام ہے۔" دادا دھمال بولا۔ "اشونی کمار میرا بچپن کا دوست ہے۔ وہ مجھے دادا دھمال کہتا ہے۔ میں اُسے دادا گُنی کہتا ہوں۔ کل رات کو میں اشونی کمار سے ملا تھا۔ میں نے کہا۔ "دادا گُنی، میری پکچر میں کام کرے گا؟" وہ بولا۔ "دادا دھمال میرے پاس اس وقت بیس پکچر ہیں۔ ایک تمھاری اور ہو جائے گی تو کیا حرج ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "مگر میں پہلے دس دن تک ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ اور دوسروں سے کم بھی دوں گا۔" وہ بولا۔ "تو میرے بچپن کا دوست ہے، تو اگر ایک پائی بھی نہ دے۔ تو پروا نہیں۔ میں دوسروں سے ڈھائی لاکھ لیتا ہوں۔ تجھ سے دو لاکھ لے لوں گا۔"

"میں نے کہا۔" میں پونے دو لاکھ سے ایک پائی زیادہ نہ دوں گا۔ وہ بولا۔ "مجھے یار کی یاری سے کام ہے۔ اس کے روپے سے کیا کام؟ بس سودا ہو گا۔"

"مگر؟" میں نے کہا۔

ٹمن فوراً بولا۔ "اور میں برجیند رکمار کے پاس گیا تھا۔ کسی زمانے میں ہم دونوں ایک ہی ڈائرکٹر کے اسسٹنٹ تھے۔ ہم دونوں نے اکٹھے ہی مصیبتیں اٹھائیں، اور دکھ جھیلے۔ بھگوان نے آج برجیند رکمار کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ مگر شاباش ہے اس انسان کو۔

وہ آدمی اپنے دوستوں کو نہیں بھولا۔ جب میں نے برجیندر کمار سے آپ کی پکچر میں کام کرنے کے لیے کہا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ میرا ہاتھ دبا کر بولا۔ "کُتے تیری پکچر میں کام کیسے نہیں کروں گا۔"

"اُس نے تمھیں کُتا کہا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

سمن بولا۔ "وہ مجھے پیار سے کُتا کہتا ہے۔ کیوں کہ میں اپنے دوستوں کا بے حد وفادار ہوں اور میں اُسے جیّ کہتا ہوں۔ میں نے کہا۔ "جیّ تجھے پہلے دس دن ایڈوانس لیے بغیر کام کرنا ہوگا۔ اور پیسے بھی دوسروں سے کم دوں گا۔" وہ بولا۔ "کُتے، پیسے کی بات مت کر مجھ سے۔ دوسروں سے چار لاکھ لیتا ہوں تو ایک کھوٹا پیسہ بھی دے گا تو لے لوں گا۔" بس میں اُسے دو لاکھ پر راضی کر کے آگیا۔"

"دو لاکھ زیادہ دیئے تم نے۔ پونے دو کہے ہوتے۔" دادا دھمال نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ اشوتی کمار خفا ہو جائے گا۔"

"تو پونے دو کرا دوں گا۔ جیّ تو اپنی مٹھی میں ہے۔"

"پونے دو اور پونے دو ساڑھے تین لاکھ تو یہ ہو گئے اور تم اڑتالیس روپے بتاتے تھے۔ یہ رقم کون دے گا؟"

"سیٹھ! دس دن میں تو میں پکچر ایک تہائی ختم کر دوں گا۔" دادا دھمال بولا۔ "پھر ڈسٹری بیوٹرز کو پکچر دکھا کر ان سے روپے لے لیں گے۔ ایک ٹیریٹری سے ایک لاکھ کی پہلی قسط آئے گی۔ چھ جگہوں سے چھ لاکھ گھر بیٹھے آجائیں گے۔"

اُدھر سے چیک آئے گا، اِدھر دے دیا جائے گا۔"

"اپنی جیب سے ایک دھیلا نہیں جائے گا۔" سمن بولا۔

"پکچر جانی بھائی کے سٹوڈیو میں بنے گی۔ وہی سیٹ بنائے گا۔ فرنیچر اور کپڑے دے گا۔ اسی کے کینٹین سے چائے آئے گی۔ اسی کی لیبارٹری میں پکچر ڈھلے گی اور تیار ہوگی۔ اس سارے خرچ کا ذمہ دار وہی ہوگا۔"

"وہ کیوں ذمے دار ہوگا؟" سیٹھ بھسوڑی مل نے پوچھا۔

کیوں کہ ہم پکچر کے ختم ہونے پر اُسے دو لاکھ روپے دیں گے۔"

"دو لاکھ ہم کہاں سے دیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"تم نہیں دو گے سیٹھ! وہ ڈسٹری بیوٹر دے گا جو پکچر اٹھائے گا۔ اپنی جیب سے ایک دھیلا نہیں جائے گا۔"

"اور ہیروئن؟" سیٹھ بھسوڑی مل نے پوچھا۔

"اس کا بھی بندوبست ہوگیا" دادا دھمال بولا "میں پریم بالا سے بات کر کے آرہا ہوں۔ پریم بالا کو میں نے سب سے پہلے اپنی پکچر میں چانس دیا تھا جب سے وہ میری احسان مند ہے۔ وہ بے چاری بھی دس دن تک ایک پیسہ نہیں لے گی۔"

سیٹھ بھسوڑی مل نے کہا۔ "جب سب لوگ مفت کام کر رہے ہیں تو پھر اڑتالیس روپوں کی کیا ضرورت ہے؟"

"سیٹھ، مہورت کے لیے پیڑے آئیں گے۔ میں نے حساب لگا لیا ہے اڑتالیس روپے کے پیڑے آئیں گے۔"

"ویسے میں تو ایک حلوائی کو جانتا ہوں" سمن بولا۔ "جو اُدھار پر پیڑے بھی دے دے گا۔"

"نہیں نہیں" میں نے جلدی سے کہا۔ "حلوائی سے ادھار کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں ہم۔"

"مگر کمپنی کے لیے ایک آفس تو بنانا پڑے گا۔ اس کے لیے ایک کلرک ٹائپسٹ وغیرہ رکھنا پڑے گا۔ ٹائپ رائٹر آئے گا۔" سیٹھ بھسوڑی مل نے کہا۔

"سیٹھ! کمپنی کا آفس ہم آپ کے آفس میں رکھیں گے" سمن بولا "ایسا ہم نے سوچا تھا۔ اب اتنا سا ہمارا کام تو آپ بھی کر دیں گے۔ رہا ٹائپسٹ اور اکاؤنٹنٹ۔ تو میں خود حساب کتاب کر لیتا ہوں۔ ٹائپ بھی جانتا ہوں۔ خواہ مخواہ پیسے برباد کرنے کی ضرورت کیا ہے؟"

"یہ سب کام سمن کر لے گا" دادا دھمال بولا۔ "اپنی جیب سے ایک دھیلا نہیں جائے گا۔"

سیٹھ بھسوڑی مل میری طرف دیکھنے لگا، میں اس کی طرف — سچ بات تو یہ تھی کہ ہم دونوں کو انھوں نے قائل کر لیا تھا، واقعی پکچر پر اڑتالیس روپے خرچ ہوں گے۔ اس سے

زیادہ نہیں آسکتا تھا۔ مگر اڑتالیس لاکھ کہاں سے آئے گا؟"

"سیٹھ، پکچر ٹیکنی کلر میں اور بڑے سکرین کی تیار ہوگی۔ ایسی غضب کی پکچر بناؤں گا کہ لوگ سیسل بی ڈی مل کو بھول جائیں گے۔ فلم ناگن نے تین کروڑ روپے کا بزنس کیا ہے۔ مغل اعظم چھتیس کروڑ کا بزنس کر چکی ہے۔ کیا ہماری قسمت میں اڑتالیس لاکھ بھی نہ آئے گا؟"

"اور اگر کم بھی آئے گا تو کیا ہوا؟" سمن بولا "اپنی جیب سے تو ایک دھیلا نہیں جائیگا۔"

"فلم کمپنی کا نام کیا رکھا ہے؟" میں نے لیٹر پیڈ کھولتے ہوئے پوچھا۔

"ڈنکی لا پروڈکشن" سمن بولا۔

"ڈنکیلا پروڈکشن" دادا دھمال بولا۔

دونوں خوش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں مسرت سے جھوم جھوم گیا کیوں کہ لیٹر پیڈ پر ڈنکیلا پروڈکشن جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اور ان کے اُوپر ایک گدھے کی تصویر تھی۔ دادا دھمال نے اس تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"سیٹھ، یہ ہماری کمپنی کا مونوگرام ہوگا، ور پکچر میں بھی سب سے پہلے یہی تصویر آئے گی۔ بس اب مونہہ میٹھا کراؤ اور مہورت طے کر دو۔"

ٹھیک اڑتالیس روپے میں پکچر کی مہورت ہوگئی۔

مگر اس کے بعد تھوڑی سی گڑبڑ ہوگئی۔ مہورت پر کچھ لوگوں نے کوکا کولا مانگ لیا۔ اور ان کے لیے کوکا کولا کی ایک ایک گاڑی منگا نا پڑی۔ پھر پان اور سگریٹ کے خرچ کا تو ہم نے سوچا ہی نہ تھا۔ مہورت لگنے والے جوتشی نے بھی روپے مانگے۔ پھر ادھر اُدھر جانے میں ٹیکسی کے کرائے پر بہت خرچ ہوا تھا اس لیے ہم لوگوں نے ایک گاڑی، سٹیشن ویگن خرید لی۔ گاڑی بھی نئی خریدنی پڑی۔ کیوں کہ دادا دھمال نے بتایا کہ یہ تو بے حد ضروری ہے۔ یہ سب توشو کا کام ہے۔ سیکنڈ ہینڈ گاڑی دیکھ کر ڈسٹری بیوٹر کم دام دے گا۔ نئے ماڈل کی بڑی گاڑی دیکھ کر بھاؤ اپنے آپ چڑھ جائے گا۔ ویسے ہمیں کچھ کہنا نہیں

ہے ۔ اس سلسلے میں تو آپ ایسے بڑے سیٹھ کو تو گاڑی رکھنی ہی چاہیے ۔ اس گاڑی کو ہم پکچر کے لیے بھی استعمال کرلیں گے ۔ ڈنکیلا پروڈکشن کا ایک سٹیشن ویگن بھی ہوگا تو شو اور بڑھ جائے گی پھر کون سا اپنے گرسے سے مال خرچ کرتا ہے ہمیں دس دن کے بعد ڈسٹری بیوٹر سے پیسہ آنے والا ہے ۔ چھ لاکھ آئے گا ۔ اس میں اپنی گاڑی اور سٹیشن ویگن اور ڈرائیور کا خرچہ بھی نکال لیا جائیگا۔"

"اپنی جیب سے ایک دھیلا نہیں جائے گا۔" ٹمن بولا ۔

مہورت تو واقعی اڑتالیس روپے میں ہوگئی تھی ۔ مگر جب سٹیشن ویگن اور موٹر گاڑی اور دوسرے اِدھر اُدھر کے خرچ ملا کر حساب کیا تو معلوم ہوا کہ اب تک پکچر پر میرا اڑتالیس ہزار خرچ ہو چکا ہے ۔

اور ابھی صرف مہورت ہوئی تھی ۔

میں نے پکچر بند کر دینے کی سوچی ۔ مگر سیٹھ بھسوڑی مل نے مجھے سمجھایا: "اتنے دنوں سے میں غور سے دیکھ رہا ہوں ، مجھے دادا دھمال اور ٹمن شریف اور دیانت دار آدمی معلوم ہوتے ہیں ۔ مگر ان لوگوں کو بزنس کا زیادہ تجربہ نہیں ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کی فلم کمپنی کا بزنس بھی سنبھال لوں ؟"

"اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے ؟" میں نے خوش ہو کر کہا ۔ اور سیٹھ بھسوڑی مل کو ان کی خدمات کے صلے میں چار آنے کی پارٹنرشپ بھی دے دی ۔

"اس کی کیا ضرورت ہے ؟" سیٹھ نے کہا ۔

"نہیں جناب ۔ میں کسی کا حق مارنے کے حق میں نہیں ہوں ۔ جو آدمی محنت کرتا ہے ، اسے اس کا صلہ جلد یا بدیر ملنا چاہیئے ۔ اور پھر میرا اس میں کیا نقصان ہے ۔ ڈسٹری بیوٹر سے پیسہ آئے گا اور سب کو بانٹا جائے گا اپنی جیب سے ایک دھیلا نہیں جائے گا۔"

مہورت کے چند دن بعد کہانی پر بحث ہوئی ۔

"پکچر کی کہانی کیا ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"کہانی؟" دادا دھمال گڑبڑا کر بولا۔

"پکچر میں کہانی نہیں ہوتی" ثمن نے اقرار کیا۔

"پھر بھی اس پکچر کی کہانی کیا ہے؟" میں نے اصرار کر کے پوچھا۔

ثمن نے سوچ سوچ کر ایک انگلی اٹھائی۔ دادا دھمال نے پورا ہاتھ اُٹھا کر اپنے دوسرے ہاتھ پر اس زور سے مارا کہ میں حیرت سے اُچھل پڑا۔

"کوئی مچھر تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، کہانی"

"کہانی؟"

"ہاں، غضب کی، فسٹ کلاس، عظیم الشان، ریکارڈ توڑ"

"کہانی ابھی ابھی ذہن میں آئی ہے"

"کیا کہانی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سوہنی مہیوال"

"سوہنی مہیوال؟" میں نے پوچھا۔ "سوہنی مہیوال تو بن چکی ہے"

"اجی ایک بار نہیں، تین بار بن چکی ہے" ثمن نے جواب دیا۔ "اور دو بار سلور جوبلی منا چکی ہے۔ ایسا غضب کا سبجیکٹ سوچا ہے دادا۔ داد دیتا ہوں۔ سوہنی مہیوال"

"اور وہ بھی ٹیکنی کلر میں" دادا دھمال بولا۔

"اور وہ بھی چوڑے سکرین پر" ثمن نے لقمہ دیا۔

"اور میں اس میں ایک بڑی تبدیلی کرنے والا ہوں — میں اس میں ایک آئیڈیا لگاتا ہوں، جس سے یہ کہانی سلور جوبلی منانے پر، بلکہ گولڈن جوبلی منانے پر، بلکہ ڈائمنڈ جوبلی منانے پر بھی پکچر ہاؤس سے نہ ہٹے۔ اجی جناب اس تصویر کو تو اب پولیس ہی سینما سے اُتارے گی"

"وہ کیا تبدیلی ہے؟" ثمن نے عقیدت مند نگاہوں سے دادا دھمال کی طرف دیکھتے

ہوئے پوچھا۔

"سنو" دادا بولا۔ "اشونی کمہار ایک گدھا ہے۔ پریم بالا اس کی بیٹی ہے۔ جس کا نام سوہنی ہے۔ سوہنی پر برجیندر کمار عاشق ہوتا ہے، جس کا نام مہیوال ہے، سمجھ گئے؟"

"ہاں سمجھ گئے" میں نے کہا۔

"اب میں اس میں ایک آئیڈیا لگاتا ہوں۔"

"کیا؟"

"کمہار کا گدھا۔"

"کمہار کا گدھا؟" سمن نے حیرت سے پوچھا۔

دادا نے چمک کر کہا۔ "ہر کمہار کے ایک گدھا نہیں ہوتا ہے؟ سو یہ گدھا ہماری کہانی میں بھی موجود ہے۔ سوہنی مہیوال کی کہانی میں بھی کمہار کا ایک گدھا ہے۔ مگر افسانہ نگار نے اس گدھے سے کوئی کام نہیں لیا ہے۔ میں اس کمہار کے گدھے سے پکچر میں وہ کام لوں گا، وہ کام لوں گا کہ لوگ سوہنی مہیوال کو بھول جائیں گے۔"

"وہ کیسے؟"

"مثال کے طور پر جب سوہنی کو مہیوال سے محبت ہو جاتی ہے تو وہ اس گدھے کے گلے میں باہیں ڈال کر روتی ہے۔ اسے اپنے عشق کا ہم راز بنا لیتی ہے بے چارا بے زبان گدھا سب سنتا ہے۔ سب سمجھتا ہے۔ مگر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ پریم بالا اپنے محبوب کے فراق میں ایک گیت گاتی ہے۔ اور تب اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔"

"کس کی آنکھوں سے؟ پریم بالا کی؟"

"نہیں گدھے کی! وہ بے زبان آنکھیں مگر ہمدردی اور درد اور محبت کے سوز میں ڈوبی ہوئی۔ ایک بے زبان جانور کی آنکھیں جب آنسو بہائیں گی تو ہال میں کون ایسا ہوگا جو رو نہ دے۔"

"اب ایک آئیڈیا اور لگاتا ہوں۔"

"لگائیے" سمن نے روتے روتے کہا۔

"گدھے کو سوہنی سے ہمدردی ہو جاتی ہے، اور وہ اسے اپنی پیٹھ پر سوار کر کے چل

دیتا ہے۔ مہیوال سے ملانے کے لیے۔ راستے میں ایک خندق آتی ہے وہ اسے چھلانگ مار کے پار کر جاتا ہے۔ پھر ایک دیوار آتی ہے وہ اسے بھی پھلانگ جاتا ہے پھر دریائے چناب آتا ہے۔ سوہنی اِدھر، مہیوال اُدھر۔ بیچ میں گدھا۔

"یہیں جناب! اب کیا ہو؟ دریا کی روانی زوروں پر ہے۔ لہریں چنگھاڑ رہی ہیں۔ اب کیا ہو؟ بھگوان کا نام لے کر گدھا دریا میں کود پڑتا ہے ــــ اور لہروں کو چیرتا ہوا دوسرے کنارے تک پہنچ کر سوہنی کو مہیوال سے ملا دیتا ہے۔ تالیاں۔ پُرزور تالیاں۔"

"پھر کیا ہوتا ہے؟" میں نے آگے جُھک کر پوچھا۔ مجھے کہانی میں بے حد دلچسپی پیدا ہو چلی تھی۔

"پھر جناب یہ ہوتا ہے کہ کمہار کو پتہ چل جاتا ہے کہ سوہنی گدھے پر سوار ہو کر ہر روز رات کو مہیوال سے ملنے جاتی ہے اس پر غصّے میں آکر وہ سوہنی کو ایک کمرے میں بند کر دیتا ہے اور گدھے کو ڈنڈے مار مار کر اَدھ مرا کر دیتا ہے۔ ذرا سین ملاحظہ فرمایئے۔ اندر کمرے میں پریم بالا رو رہی ہے۔ باہر گدھا مار کھا رہا ہے۔ مار کھاتے کھاتے گدھا بے ہوش ہو جاتا۔ کمہار اسے وہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور سوہنی کے کمرے کے باہر دروازے پر کنڈی لگا جاتا ہے۔

"اب دیکھیے میرا آئیڈیا۔ رات ہے۔ گدھا بے ہوش ہے۔ سوہنی کمرے میں بند ہے۔ دریا کے پار مہیوال انتظار کر رہا ہے۔ سوہنی غصّے میں آکر دروازہ پیٹتی ہے۔ مگر کوئی دروازہ نہیں کھولتا۔ دروازہ پیٹنے کی آواز سُن کر گدھے کو ہوش آجاتا ہے۔ وہ سب سمجھ جاتا ہے۔ مگر کیا کرے کیا نہ کرے ــ بے زبان جانور اور زخمی۔ خیر کسی نہ کسی طرح گھسٹ کر کمرے کی طرف بڑھتا ہے۔ دروازے پر پہنچ کر اپنی لمبی گردن اونچی کر کے اپنی تھوتنی مار مار کر باہر سے کنڈی کھولنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ دروازہ کھُلتا ہے۔ سوہنی برآمد ہوتی ہے۔ اُچک کر گدھے کی پیٹھ پر بیٹھتی ہے۔ گدھا زخمی ہے۔ اس سے چلا نہیں جاتا۔ مگر مالکن کی ہمدردی میں وہ تیر کی طرح اڑا جاتا ہے۔ اور چناب کا پاٹ تیر کر سوہنی کو مہیوال کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ تالیاں۔"

ہم لوگ خوشی سے تالیاں پیٹنے لگے۔

"اب کمہار کو بہت غصہ آتا ہے۔ اور وہ اپنے گدھے کو کسی دوسرے کمہار کے ہاتھ بیچ دیتا ہے جو کسی دوسرے گاؤں میں رہتا ہے۔ دن بھر سوہنی گدھے کو ڈھونڈتی ہے۔ رات کو ادھر چناب کے کنارے مہیوال سوہنی کا انتظار کرتے ہوئے گاتا ہے۔ "آجا آجا میری سوہنی"۔ سوہنی گدھے کو تلاش کرتے ہوئے گاتی ہے۔ "آجا آجا میرے گدھے"۔ ڈوئیٹ ختم ہونے پر گدھا دوسرے مالک کے گھر سے رسی تڑا کر پھر عین وقت پر پہنچ جاتا ہے۔ تالیاں"۔

"مگر سوہنی مہیوال تو ایک ٹریجڈی ہے"۔ میں نے کہا۔

"ہاں ٹریجڈی تو ہے"۔ دادا بولا۔ "آخری دن یہ ہوتا ہے کہ کمہار گدھے کو بند کر کے باہر تالا لگا دیتا ہے۔ اب سوہنی چناب کے پار کیسے جائے گی؟ مگر وہ ایک کچا گھڑا لے کر چل دیتی ہے۔ ادھر گدھا دیوار سے ٹکریں مار مار کر دیوار توڑ دیتا ہے۔ (گاؤں میں تو کچی مٹی کی دیواریں ہوتی ہیں نا؟) اور باہر نکل کر سوہنی کو ڈھونڈتا ہے۔ اتنے میں وہ چھپ کر سُن لیتا ہے کہ سوہنی ایک کچے گھڑے کو لے کر چناب پار کرنے گئی ہے۔ وہ سب کی نظر بچا کر دریا کی طرف بھاگتا ہے۔ مگر کمہار کو پتہ چل جاتا ہے۔ وہ بندوق اٹھا کر گدھے کو گولی مار دیتا ہے۔ مگر گدھا، بے زبان، بے چارہ، مظلوم، وفادار گدھا، گولی کھا کر سخت زخمی ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی دریا کی طرف دوڑ جاتا ہے۔

ادھر دریا کے اس پار مہیوال سوہنی کا انتظار کر رہا ہے اور گاتا ہے۔ سوہنی بغل میں کچا گھڑا دبائے دوڑتی جا رہی ہے۔ دور پیچھے سے گدھا بھاگتا چلا آ رہا ہے تاکہ مالکن کو کچے گھڑے پر سوار ہو کر چناب پار کرنے سے روک دے۔ آج بادل گھر کر آئے ہیں۔ طوفان گرج رہا ہے۔ چناب ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

مہیوال چلاتا ہے۔ "سوہنی! سوہنی! کیا تو بھی بے وفا نکلی؟" سوہنی چلا کر کہتی ہے۔ میں کیسے بے وفائی کروں گی۔ میرا رشتۂ الفت تو بالکل پکا ہے"۔

"مگر گھڑا تو کچا ہے"۔ گدھا سوچتا ہے اور اپنے جسم کی آخری قوت استعمال کرتے ہوئے دریا کی طرف بھاگتا ہے۔ مگر سوہنی اُس کے پہنچنے سے پہلے ہی دریا میں چھلانگ لگا دیتی ہے۔ زخمی گدھا کنارے پر گر جاتا ہے۔ سوہنی کچے گھڑے کے ساتھ بہہ جاتی ہے۔ مہیوال اسے بچانے کے لیے دریا میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ مگر پانی کی خوفناک

لہروں میں دونوں محبت کے مارے ڈوب جاتے ہیں۔ گدھا بھی ایک آخری ہچکی لے کر دم توڑ دیتا ہے۔"

کہانی ختم کر کے دادا دھمال اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو پونچھنے لگا۔

سیٹھ بھسوڑی مل نے کہا۔ "مجھے تو یہ سوہنی مہیوال کی کہانی کم اور گدھے کی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔"

"مگر کس غضب کی کہانی ہے۔ سچ کہتا ہوں سیٹھ۔ میرے تو بدن کے ٹکڑے ہو گئے۔" میں نے اقرار کیا۔

"سوال یہ ہے۔" سمن بولا۔ "ایسا اچھا کام کرنے والا گدھا کہاں سے ملے گا؟"

دادا دھمال نے کہا۔ "کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ گدھا تو سامنے بیٹھا ہے۔"

"میں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں سیٹھ۔" دادا دھمال نے بڑی لجاجت سے کہا۔ "اگر تم میری کہانی میں کام کرو تو میری تقدیر سنور جائے۔"

"مگر میں تو ایک گدھا ہوں۔ کیا اتنے بڑے بڑے فلم سٹار ایک گدھے کے ساتھ کام کرنا پسند کریں گے؟"

"وہ دن رات اور کرتے کیا ہیں؟" سمن بولا۔

"آپ مان جایئے۔ ان کو منانا میرا کام ہے۔"

"مگر میں نے آج تک ایکٹنگ نہیں کی۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اور یہ رول تو بہت بڑا ہے۔ اس کہانی میں تو گدھا تقریباً ایک ہیرو ہے۔"

"شروع میں ہر ہیرو گدھا ہوتا ہے۔" سمن بولا۔ "تین چار پکچریں چوپٹ کرنے کے بعد کہیں اسے عقل آتی ہے۔ مگر آپ کوئی ایسے ویسے معمولی گدھے نہیں ہیں۔ پڑھے لکھے گدھے ہیں۔ پھر بے حد حساس اور نیک دل گدھے ہیں۔ آپ کے لیے ایکٹنگ کرنا کیا مشکل ہے۔"

"ارے مالک! دادا دھمال نے سمجھایا۔ "آپ تو دو چار دن میں ایسے طاق ہو جائیں گے کہ بڑے سے بڑے ہیرو کے کان کاٹنے لگیں گے۔ رول تو وہ دھانسو ہے کہ پکچر ختم ہونے سے پہلے ایک ایک لاکھ کے دس کنٹریکٹ آپ کی جیب میں ہوں گے۔"

"وہ کیسے؟ میں کوئی فلم سٹار ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"اجی دھڑلے کی پبلسٹی ہو تو گدھا بھی فلم سٹار بن سکتا ہے۔ آج کل کا زمانہ ہی پبلسٹی کا ہے۔ آپ کام کیجیے اور اپنی پبلسٹی کے لیے دو لاکھ روپیہ منظور کیجیے۔ پھر دیکھیے کیسا رنگ جماتا ہوں۔"

"مجھے منظور ہے۔" میں بے دھڑک ہو کر بولا۔

پہلے دن کے رش پرنٹ دیکھ کر فلم سٹار پریم بالا میرے گلے سے لگ گئی اور بولی۔ "کیسے غضب کے ایکسپریشن دیئے ہیں تم نے! دلیپ کمار کو مات کر دیا۔"

"واقعی؟" میں نے بے حد خوش ہو کر پوچھا۔

"اور وہ دریا کے کنارے تمھارا لڑکھڑا کے چلنا۔ جب مہیوال مجھ سے ملنے کے لیے آتا ہے۔ اس سین میں تو تم نے کمال ہی کر دیا۔ بالکل چارلی چپلن کی سی اداکاری ہے۔"

"نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کمزور لہجے میں احتجاج کیا۔ مگر میرا دل اندر ہی اندر بلیوں اُچھل رہا تھا۔

"سچ کہتی ہوں۔ اور وہ ۔ تمھارا وہ کلوز اپ کس قیامت کا ہے جس میں کمہار کی نظر بچا کر تیزی سے تم میرے پاس آجاتے ہو۔ اور مجھے اپنی پیٹھ پر سوار کر لیتے ہو۔ بالکل دیوانند کی سی شوخی ہے تم میں۔ مجھے معلوم نہیں تھا اس گدھے کی کھال کے اندر اتنا بڑا اداکار چھپا بیٹھا ہے۔"

پھر وہ عجیب طرح سے ہنس کر کہنے لگی۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ فلم کے ختم ہوتے ہوتے میں مہیوال کی بجائے تم سے عشق کرنے لگوں ـــ" اتنا کہہ کر وہ زور سے ہنسی، اپنی بیباکی پر

کچھ شرمائی بھی۔ پھر اس نے ایک لمحے کے لیے میری طرف بڑی عجیب نظروں سے دیکھا۔ اور دوسرے لمحے ہیں لجا کر موتہہ پھیر لیا۔ میں بھی اس کی ہنسی میں شریک ہوگیا۔ جیسے یہ سب ایک دلچسپ مذاق تھا۔ مگر اس کی عجیب عجیب نگاہیں دیکھ کر میرا دل زور سے دھک دھک کرنے لگا تھا۔

اسی شام اتفاق سے وہ ہمارے گھر آگئی۔ بہت پریشان اداس معلوم ہوتی تھی جب میں نے دریافت کیا تو صاف ٹال گئی کہ کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن جب میرا اصرار بڑھتا ہی گیا تو بولی۔

"کیا بتاؤں ڈارلنگ! وہ میرا ایک کیس ہے انکم ٹیکس کا۔ اس کے حساب میں کچھ گڑبڑ ہوگئی۔ اور مجھے انکم ٹیکس والوں نے دو لاکھ کا جرمانہ کیا ہے۔ کل وہ جرمانہ بھرنا ہے اور میرے بینک میں اس وقت صرف پچاس ہزار روپے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں ؟"

میں نے کہا۔ "تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے ؟ ڈیڑھ لاکھ کا چیک میں دیئے دیتا ہوں۔"

"نا۔" وہ سر ہلا کر بولی۔ "تم سے میں نہ لوں گی۔ میں نے دس دن تک تمھاری پکچر میں فری کام کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ میں ہرگز ہرگز تم سے رقم نہ لوں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا ناکہ میں جیل چلی جاؤں گی مگر میں اپنے وعدے سے نہ پھروں گی۔"

"ہمارے ہوتے ہوئے تم جیل جاؤ گی ؟" میں نے دلیر عاشق کی طرح کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ڈیڑھ لاکھ کا چیک تو تمھیں لینا ہی پڑے گا۔"

وہ انکار کرتی رہی۔ میں اصرار کرتا رہا۔ آخر میرے شدید اصرار پر وہ مان گئی اس شرط کے ساتھ کہ وہ یہ رقم ایک ماہ کے اندر مجھے لوٹا دے گی۔ میں مان گیا۔ اس پر اس نے چیک لے لیا۔

پھر میں نے تھوڑی سی وہسکی پی لی، اور اس نے تھوڑی سی شیری پی۔ پھر وہ کچھ دیر تک میرے ریڈیو پروگرام پر ریکارڈ بجاتی رہی۔ پھر بولی۔

"تمھیں ناچنا آتا ہے ؟"

میں نے ہنس کر کہا۔ "خاک۔ رقص رقص صرف دولتی جھاڑ سکتا ہے۔"

"گنوار مت جنو۔" وہ مجھے ڈانٹ کر بولی۔ "یہ تم نے اپنی کیا صورت بنا رکھی ہے۔ ہر وقت گلے میں ایک جھولا ڈالے گھومتے ہو۔ کوٹ پتلون پہنا کرو۔ ٹائی لگایا کرو۔ آؤ تمھیں ڈانس سکھاؤں۔ عمدہ محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے کے لیے مغربی ناچ سے واقفیت ضروری ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے سلو فوکس ٹروٹ کا ایک ریکارڈ لگا دیا اور غالیچے کے فرش پر مجھے ڈانس سکھلانے لگی۔

"ون۔ ٹو۔ تھری۔"

وہ تال دے کر چٹکی بجاتی تھی اور میں ناچتا جاتا تھا۔ وقت کیسے گزر گیا اس کا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ میں ایک گدھا ہوں۔ ان لمحوں میں میں نے اپنے آپ کو ایک انسان کی طرح محسوس کیا۔ خوب صورت، کشادہ کمرہ، غالیچہ، ریڈیوگرام بجتا ہوا، نیلی نیلی مدھم جھلملاتی ہوئی روشنیاں۔ اور ایک حسین پیارا گلابی چہرہ، مسرتوں کی کرنیں برساتا ہوا، یہ ہے زندگی۔ اور اس زندگی سے اس دنیا کے کروڑوں گدھے کتنی دور ہیں۔

یکایک اس نے چونک کر اپنی گھڑی دیکھی اور گھبرا کر بولی۔

"اُف۔ نو بج گئے۔ گھر پر ماں جی انتظار کر رہی ہوں گی۔ اب میں جاتی ہوں کل سٹوڈیو میں ملیں گے۔ ٹاٹا۔" وہ جلدی سے میرے کان پر جھکی۔ ایک بوسہ دیا اور گھوم کر تیزی سے باہر چلی گئی۔

ان ہی دس دن کی شوٹنگ میں ایک اور عجیب واقعہ ہوا۔ کمہار کی گلی کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ برتن چاک پر گھمائے جا رہے تھے۔ کمہار اور کمہارنیں اپنے کاموں میں مصروف بچے کھیلتے ہوئے اور شور مچاتے ہوئے، لائیٹس مین کبھی روشنیاں بجھاتے ہوئے کبھی جلاتے ہوئے۔ عجیب گہما گہمی کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ایک طرف درختوں کا جھنڈ لگایا گیا تھا۔ اس کے نیچے کئی گدھے گھاس میں مونہہ مار رہے تھے۔

میں نے دادا دھمال سے پوچھا۔ "ان گدھوں کو کیوں بلایا ہے؟"

وہ بولا۔ "کمہاروں کی گلی کا سین ہو اور اس میں گدھے نہ ہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"میں ان گدھوں کے ساتھ کام نہ کروں گا۔" میں نے غصے سے چلا کر کہا۔

"نہیں سیٹھ، یہ تو ایکسٹرا گدھے ہیں۔ بھلا ان کا آپ کا کیا مقابلہ! یہ تو سین کی شوبھا بڑھانے کے لیے منگا لیے گئے ہیں۔ ان کو تو گدھا کہنا بھی لفظ گدھے کی توہین کرنا ہے۔ آپ تو گدھے ہیں سیٹھ۔ مگر یہ تو آوارہ بازاری ٹٹو ہیں۔"

"کہاں آپ ایسا گدھا۔ کہاں یہ ٹٹو۔ کہاں راج بھوج، کہاں گنگو تیلی۔" نُمن جلدی سے بولا۔ "آپ کا کام تو صرف بڑے بڑے فلم ستاروں کے ساتھ ہوگا۔ اشوک کمار کے ساتھ، برجیندر کمار کے ساتھ۔ پریم بالا کے ساتھ۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" میں نے اپنا غصہ دور کرتے ہوئے کہا۔

دادا دھمال میرے بالکل قریب آکر بولا۔ "اب تو میں نے سکرپٹ بالکل بدل دیا ہے۔ اب تو تقریباً ہر سین میں جہاں پریم بالا آتی ہے وہاں آپ کا کام بھی رکھا ہے۔"

"شاباش۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے رہ نہ گیا اور میں ان گدھوں کے قریب چلا گیا۔ قریب جاتے ہی میں نے اس مغربی گدھی کو پہچان لیا جس سے میں نے زندگی میں پہلی بار جوزف کے جھونپڑے کے باہر اظہار عشق کیا تھا۔ مگر اب اس گدھی کا رنگ اُڑا اُڑا سا تھا۔ کان جھکے ہوئے۔ پیٹ پچکا ہوا، اور پسلیاں؟ ۔ ایک ایک پسلی کھال کے اندر سے نظر آ رہی تھی ۔ جیسے صدیوں سے اس نے پیٹ بھر کے گھاس نہ کھائی ہو۔

میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ "اے ماہ لقا! نظریں اُٹھا، دیکھ کون تیرے سامنے کھڑا ہے؟"

وہ چونک گئی۔ اس نے گھوم کر کئی لمحوں تک مجھے گھور کر دیکھا۔ مگر مجھے پہچان نہ سکی۔

"تم کون ہو؟" وہ پریشان ہو کر بولی۔

"میں وہی تمہارا پرانا عاشق ہوں جس کی محبت کو تم نے جوزف کے جھونپڑے کے

باہر ٹھکرا دیا تھا۔"
اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ وہ حیرت سے میری طرف تکتی رہ گئی۔ آخر رک رک کر بولی۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ کیا ہمارے ساتھ ایکسٹرا گدھوں میں لائے گئے ہو؟"
"جی نہیں۔ جس فلم کمپنی میں کام کرنے کے لیے آپ کو بلایا گیا ہے، میں اس کا پروڈیوسر ہوں۔"
"فلم پروڈیوسر؟" وہ حیرت سے چیخی۔ "ایک گدھا؟"
"جس گدھے کے پاس چند لاکھ روپیہ ہو، وہ فوراً پروڈیوسر بن سکتا ہے۔ پروڈیوسر بننے کے لیے کسی دوسری قابلیت کی ضرورت نہیں۔ میم صاحب، وکیل کو وکالت کا امتحان پاس کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر کو ڈاکٹری، انجینئر کو انجینئری۔ مگر پروڈیوسر کے لیے کسی کوالی فکیشن کی ضرورت نہیں۔ صرف روپیہ چاہیے۔"
وہ حیرت سے میری طرف دیکھتی رہ گئی۔ "تم نے اتنا روپیہ کہاں سے کمایا ہے؟"
"سٹے سے۔"
"کتنا؟"
"بتیس لاکھ۔"
"بتیس لاکھ۔ باپ رے۔" وہ سر سے پاؤں تک مجھے دیکھنے لگی۔ میرے اوپر ک سکن کا عمدہ کوٹ تھا اور نیچے چار ٹانگوں والی پتلون تھی۔ اور گلے میں عمدہ ٹائی میرے بال ملائم اور معطر تھے۔ اس نے میرے قریب آکر مجھے سونگھا اور پھر حسرت بھری آواز سے بولی۔ "کاش میں نے تمھاری محبت کو قبول کر لیا ہوتا۔"
میں چپ رہا۔
"تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی۔" وہ کمزور لہجہ میں بولی۔ پھر میری طرف اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر بولی۔ "کیا تم اب مجھ سے شادی نہیں کر سکتے؟"
"وقت گزر گیا مس صاحبہ۔" میں نے فخر و غرور سے تن کر کہا۔ اس وقت میں غریب تھا۔ آج میں خود ایک بڑا فلم سٹار ہوں۔ فین فیئر اور نیو سکرین میں میرے رنگین فوٹو چھپتے

ہیں۔ اب میں اپنے برابر والوں میں شادی کروں گا۔ تم سے کیوں کروں ؟"

اتنا کہہ کر میں بڑی شان سے وہاں سے گھوم گیا۔ اور ڈائرکٹر کے پاس چلا آیا اور اس سے کہا۔ "وہ ایک گدھی ہے۔ ایکسٹرا گدھوں ہیں، سنہرے بالوں والی، وہ مجھے کئی دن کی بھوکی معلوم ہوتی ہے، اس کے لیے گھاس کا بندوبست کر دو۔ اور جب تک اس کا کام ہے اسے گھاس کھلاتے رہو۔"

"کوئی پرانی یاد؟" دادا دھمال نے آنکھ مار کر پوچھا۔

"ہاں مگر بے کار۔ اور بجھی ہوئی سی۔"

حسن بولا۔ "شعلہ بجھ جائے تو راکھ ہو جاتا ہے۔ حسن اڑ جائے تو صرف حسرت باقی رہ جاتی ہے۔"

اتنے میں پریم بالا مٹکتی ہوئی میرے قریب آگئی اور بولی "کس گدھی سے باتیں کر رہے تھے۔؟"

"کوئی نہیں، ایک ایکسٹرا ہے۔"

وہ ذرا غصہ سے بولی۔ "مگر میں نے خود دیکھا ہے، تم اس کے قریب کھڑے ہو کر بڑی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔"

"تمہیں غلط بیانی ہو رہی ہے جانی! وہ تو ایک ایکسٹرا ہے، اس سے میں کیوں میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔ بس ایسی ہی وہ بے چاری مجھے بڑی بھوکی معلوم ہوئی اس لیے میں نے حکم دے دیا کہ اُسے گھاس واس ڈال دو۔"

"اُسے بالکل گھاس نہیں ڈالی جائے گی۔" پریم بالا غصے سے بھڑک کر بولی۔ "وہ اسی وقت سیٹ سے باہر نکالی جائے گی۔ ورنہ میں پکچر میں کام نہیں کروں گی۔"

وہ وہ کرسی پر مونہہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے منانے کی بہت کوشش کی مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ ناچار ہو کر مجھے اس گدھی کو سیٹ سے باہر نکالنے کا حکم دینا پڑا۔ س کے جاتے ہی پریم بالا کا موڈ ٹھیک ہو گیا اور وہ لہک لہک کر گانے لگی۔ "بیرن سوتنیا۔"

وہ اس وقت اتنی پیاری شوخ اور چنچل معلوم ہو رہی تھی کہ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے قدموں

میں گڑ کر لوٹ لگاؤں۔

دس دن کے بعد ڈسٹری بیوٹروں سے چھ لاکھ روپے آنے والے تھے مگر نہیں آئے۔
قصہ یہ ہوا کہ جانی بھائی کی لیباریٹری میں ٹیکنی کلر پرنٹ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ٹیکنی کلر پرنٹ تو
صرف لندن میں نکلتے ہیں، یا امریکہ میں بہت سوچ بچار کے بعد ٹمن کو پرنٹ نکلوانے کے
لیے لندن بھیجا گیا۔ خیال یہ تھا کہ وہ پندرہ بیس روز میں واپس آجائے گا۔ مگر کچھ ایسی ٹیکنیکل
دشواریاں پیش آئیں جنہیں دور کرنے کے لیے ٹمن کو لندن میں دو ہفتے کی بجائے چار ہفتے رہنا پڑا۔
اور پھر ان ہی ٹیکنیکل مسئلوں کو سلجھانے کے لیے اُسے لندن سے پیرس اور پیرس سے روم جانا
پڑا۔ اور معاملہ ٹلتا گیا۔

شوٹنگ روک دینے سے پریم بالا بہت بور ہونے لگی تھی۔ ایک دن اس نے مجھے مشورہ
دیا "تم شوٹنگ کیوں روک بیٹھے ہو۔ آخر ایک دن پرنٹ یورپ سے بن کر آہی جائیں گے۔
ایک دن تمہیں ڈسٹری بیوٹروں کے چھ لاکھ کے چیک بھی مل جائیں گے۔ مگر تم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے
کیوں بیٹھے ہو؟ وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟ ہمت سے کام لے کر شوٹنگ شروع کر دو۔ تمہارے
پاس پیسہ نہ ہو تو مجھ سے دو، چار، دس لاکھ لے لو۔"

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا اور اسی وقت کام شروع کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

ہم نے ٹمن کو روم میں روک دیا تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ دس دن کی شوٹنگ اور ہو جائے تو
اس کے پرنٹ بھی بنوانے کے لیے یورپ بھیج دیں۔ بدقسمتی سے پہلے دس دن کے پرنٹ
خراب نکلے۔ اس لیے دس دن تک مزید شوٹنگ کرنی پڑی۔ اس دوران میں سب لوگوں نے
تقاضے شروع کر دیئے، اور ہمیں وعدے کے مطابق سب کو روپے دینے پڑے۔ پھر ایک
روز اشوتی کمار کا کسی بات پہ پریم بالا سے جھگڑا ہو گیا۔ میں نے غصے میں آکر اشوتی کمار کا چکتا کر دیا۔
اور اس کی جگہ روپ کمار کو لے کر مزید بیس روز کی شوٹنگ کی۔ سات لاکھ اس میں نکل گئے۔
غرضیکہ اگلے سات مہینوں میں پورا پٹرا ہو گیا۔ تیس کا تیس لاکھ پکچر میں گل گیا۔ اور پکچر

ابھی نامکمل تھی۔ ڈسٹری بیوٹروں سے ایک دھیلا وصول نہ ہوا تھا، اور سیٹھ اب نیویارک میں تھا۔

میں نے سیٹھ بھسوڑی مل سے روپے مانگے۔ اس نے کورا جواب دے دیا بولا۔ "میرے خیال میں، گوروجی! آپ کو فلم کا کام راس نہیں آیا۔ میرے خیال میں تو اب آپ کو سیدھا ہمالیہ چلا جانا چاہیے۔"

میں نے دادا دھمال سے بات کی تو وہ بولا۔ "سیٹھ، کیا بتاؤں کس قدر شرمندہ ہوں۔ جانے کیسی گھڑی تھی وہ منحوس جب ہم نے یہ پکچر شروع کی تھی لے دے کے میرے پاس ایک چھکڑا گاڑی ہے، چاہو تو اُسے لے لو۔ پانچ سات سو میں تو بک ہی جائے گی۔"

"پانچ سات سو سے کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "میں نے اپنی سی پوری کوشش کر ڈالی۔ اتنا عرصہ کسی دوسری جگہ اگر کام کیا ہوتا تو اب تک شاید دو پکچریں ختم کر ڈالتا۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے سیٹھ، اگر تم کہیں سے تین لاکھ کا بندوبست کر دو تو میں تین لاکھ میں ہی پکچر ختم کر دوں گا۔ پکا وعدہ کرتا ہوں۔ تین لاکھ کے بعد سارا پیسہ ڈسٹری بیوٹر سے آجائے گا ——— اور اپنی جیب سے ایک دھیلا نہیں جائے گا۔"

مگر تین لاکھ روپے کون دے گا۔؟

دو تین دن میں اسی پریشانی میں گھومتا رہا، اور سوچتا رہا آخر ایک شام میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے پریم بالا کے ہاں جانا چاہیے اور اس سے تین لاکھ کا قرض مانگنا چاہیے۔ دیکھا جائے تو میرے روپے اس پر واجب بھی ہیں۔ اپنے کانٹریکٹ کی رقم کے علاوہ وہ مجھ سے دو لاکھ قرض لے چکی ہے۔ وہ دو لاکھ اگر واپس کر دے اور ایک لاکھ مجھے قرض دے دے تو پھر بیڑا پار ہو سکتا ہے۔

یہی سوچ کر ایک دن شام کو ہمت کر کے میں اس کے بنگلے پر [illegible]۔ ڈرائنگ روم کے اندر جاتے ہی مجھے دھچکا سا لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اشوک کمار [illegible] بیٹھی ڈرنک کر رہی

ہے۔ وہی اشونی کمار جسے میں نے پریم بالا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پکچر سے نکال دیا تھا۔ اور اس کا سارا حساب چکتا کر دیا تھا۔ اس وقت وہ اسی اشونی کمار کی آغوش میں بیٹھی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ذرا تیز ہو کر بولی۔ "کیا ہے؟ کیسا ہے؟ ایسے بن بلائے، مونہہ اٹھائے اندر کیوں چلے آئے؟"

میں نے کہا۔ "میں اس وقت ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ اس پکچر میں میرے پچیس لاکھ روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ اب اگر تین لاکھ تم دے دو تو میری پکچر مکمل ہو سکتی ہے۔"

"تین لاکھ میں دے دوں؟" وہ زور سے چلائی اور میرے قریب آکر بولی۔ "تم پاگل تو نہیں ہو۔"

"پاگل تو نہیں تھا مگر بنایا گیا ہوں۔ میں تم سے کچھ زیادہ تو مانگ نہیں رہا ہوں۔ دو لاکھ کا قرض تو تم پر واجب ہی ہے۔"

"کیسا دو لاکھ کا قرض؟" وہ پھر زور سے چیخی۔

"ڈیڑھ لاکھ تو تم نے انکم ٹیکس ادا کرنے کے سلسلے میں لیا تھا اور پچاس ہزار ایک نئی گاڑی خریدنے کے لیے لیا تھا۔ یاد آیا ڈارلنگ؟"

"ڈارلنگ؟ میں کسی کی ڈارلنگ نہیں ہوں؟" پریم بالا لپک کر بولی۔ "تم نے سُنا اشونی! یہ گدھا مجھے ڈارلنگ کہتا ہے۔"

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کل تک جب تک میری جیب میں تیس لاکھ روپیہ تھا، میں سیٹھ تھا۔ آج میں ایک گدھا ہوں۔"

"گیٹ آوٹ یو ڈرٹی ڈاگ۔" وہ دونوں ہاتھوں سے مجھے طمانچے مارنے لگی۔

مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے کہا۔ "بس پریم بالا ہوش میں آؤ ——— میں بھی اب یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔ اور جاؤں گا تو اسی وقت جاؤں گا جب آپ میرا روپیہ لوٹا دیں گی۔"

"تو نہیں جائے گا؟" وہ بولی۔

"نہیں"

"نہیں" میں نے مضبوطی سے جواب دیا۔

پریم بالا نے ایک چھڑی اٹھالی اور اشوق سے بولی۔

"اشوق، تم ڈرائنگ روم کا دروازہ تو ذرا اندر سے بند کر دو اور دوسری چھڑی بھی اٹھالو..."

پونا جانے والی لمبی، اکیلی اور اداس سڑک پر ایک گدھا چلا جارہا تھا۔

اس نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک بیل مرا پڑا ہے۔ اور اس کے سرہانے دو انسان، ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے زاروقطار رو رہے ہیں۔

"کیا ہوا؟" گدھے نے رک کر پوچھا۔

"ہمارا بیل مر گیا" مرد نے غم سے سسکتے ہوئے کہا۔

"تو دوسرا بیل خرید لو" گدھے نے مشورہ دیا۔

"کوئی دوسرا بیل اس بیل کی جگہ نہیں لے سکتا۔ ہم نے اسے بڑی مشکل سے سدھایا تھا۔ ہم اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے تھے اور کسانوں کا مجمع اکٹھا کر کے اس بیل کی مدد سے ان لوگوں کی قسمت کا حال بتاتے تھے" عورت نے روتے ہوئے اپنی بپتا کہہ سنائی۔

گدھے نے کہا۔" وہ زمانے لد گئے جب اندھے کسانوں کو ان کی قسمت کا حال بتاتے تھے۔ اور غریب کسان ایک اندھے بیل کی طرح اپنی قسمت کے کولہو کے گرد گھومتے جاتے تھے۔ یہ زمانہ آنکھیں کھول کر کام کرنے کا ہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے لو اور اپنے کسان دوستوں میں لے چلو۔ میں انھیں اخبار پڑھ کر سناؤں گا اور زندگی کی نئی تقدیر کی راہ

دکھاؤں گا جو سُنئے سے نہیں بلکہ سچی محنت سے پیدا ہوتی ہے۔

دھرتی وشال تھی ۔ آسمان بے کنار تھا۔ اور اب وہ تینوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایک مرد، ایک گدھا، ایک عورت ۔ مرد جو خالق ہے، عورت جو ماں ہے، گدھا جو زندگی کی محنت اور اس کی معصومیت ہے۔

ختم شُد

مکرمی آداب!

ایشیا پبلیشرز دہلی اردو کی خدمت پچھلے چالیس سال سے کر رہا ہے۔ اس سال ہم نے پانچ کتابیں شائع کی ہیں ان کتابوں کا بڑھیا گیٹ اپ، بڑھیا کاغذ، کتابت اور طباعت آفسیٹ پر کرائی ہے۔ سائز 16 = 22x36

۱۔ گدھے کی واپسی	از۔ کرشن چندر	قیمت -/75
۲۔ شہزادہ	از۔ کرشن چندر	قیمت -/130
۳۔ ہوائی قلعے	از۔ کرشن چندر	قیمت -/120
۴۔ کبوتر کے خط	از کرشن چندر	قیمت -/120
۵۔ ایک گرجا، ایک خندق	از۔ کرشن چندر	قیمت -/130

ہماری دیگر کتب جواب تک شائع ہوئی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

کتاب	مصنف	قیمت
محبت بھی قیامت بھی	کرشن چندر	-/80
مسرت	"	-/60
ان داتا	"	-/35
شکست	"	-/100
زندگی کے موڑ پر	"	-/35
گلشن گلشن ڈھونڈا تجھ کو	"	-/30
الٹا درخت	"	-/35
مکڑی	"	-/60
میری یادوں کے چنار	کرشن چندر	-/75
ٹوٹے ہوئے تارے	"	-/60
گیہوں اور گلاب	خواجہ احمد عباس	-/70
کرشن چندر شخصیت اور فن	جگدیش چندر ودھاون	250/
منٹو نامہ	"	
عصمت چغتائی شخصیت اور فن	"	-/250

آپ کے آرڈر کا انتظار رہے گا۔

خاکسار منیجر ایشیا پبلیشرز

ایشیا پبلیشرز

اے 36۔ چیتک اپارٹمنٹس پلاٹ نمبر 27/2۔ سیکٹر 9

روہنی دہلی 85

M/s Asia Publishers
A-36 Chetak Appt.,
Plot No:27/2
Sector 9 Rohini,
Delhi-85
T.NO:7261823

ہیں۔ اب میں اپنے برابر والوں میں شادی کروں گا۔ تم سے کیوں کروں؟"

اتنا کہہ کر میں بڑی شان سے وہاں سے گھوم گیا۔ اور ڈائرکٹر کے پاس چلا آیا اور اس سے کہا۔" وہ ایک گدھی ہے۔ ایکسٹرا گدھوں ہیں، سنہرے بالوں والی، وہ مجھے کئی دن کی بھوکی معلوم ہوتی ہے، اس کے لیے گھاس کا بندوبست کردو۔ اور جب تک اس کا کام ہے اسے گھاس کھلاتے رہو۔"

"کوئی پرانی یاد؟" دادا دھمال نے آنکھ مار کر پوچھا۔

"ہاں مگر بے کار۔ اور بجھی ہوئی سی۔"

ٹمن بولا۔" شعلہ بجھ جائے تو راکھ ہوجاتا ہے۔ حُسن اُڑ جائے تو صرف حسرت باقی رہ جاتی ہے۔"

اتنے میں پریم بالا مٹکتی ہوئی میرے قریب آگئی اور بولی "کس گدھی سے باتیں کر رہے تھے۔؟"

"کوئی نہیں، ایک ایکسٹرا ہے۔"

وہ ذرا غصہ سے بولی۔" مگر میں نے خود دیکھا ہے، تم اس کے قریب کھڑے ہو کر بڑی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔"

"تمھیں غلط بیانی ہو رہی ہے جانی! وہ تو ایک ایکسٹرا ہے، اس سے میں کیوں میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔ بس ایسی ہی وہ بے چاری مجھے بڑی بھوکی معلوم ہوئی اس لیے میں نے حکم دے دیا کہ اُسے گھاس واس ڈال دو۔"

"اُسے بالکل گھاس نہیں ڈالی جائے گی۔" پریم بالا غصّے سے بھڑک کر بولی۔" وہ اسی وقت سیٹ سے باہر نکالی جائے گی۔ ورنہ میں پکچر میں کام نہیں کروں گی۔"

وہ وہ کرسی پر مونہہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے منانے کی بہت کوشش کی مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ ناچار ہو کر مجھے اس گدھی کو سیٹ سے باہر نکالنے کا حکم دینا پڑا۔ اس کے جاتے ہی پریم بالا کا موڈ ٹھیک ہوگیا اور وہ لہک لہک کر گانے لگی۔" بیرن سوتنیا۔"

وہ اس وقت اتنی پیاری شوخ اور چنچل معلوم ہو رہی تھی کہ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے قدم لے

میں گر کر لوٹ لگاؤں۔

دس دن کے بعد ڈسٹری بیوٹروں سے چھ لاکھ روپے آنے والے تھے مگر نہیں آئے۔
قصہ یہ ہوا کہ جانی بھائی کی لیبارٹری میں ٹیکنی کلر پرنٹ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ٹیکنی کلر پرنٹ تو صرف لندن میں نکلتے ہیں۔ بالآخر یہ کہ میں بہت سوچ بچار کے بعد نمن کو پرنٹ نکلوانے کے لیے لندن بھیجا گیا۔ خیال یہ تھا کہ وہ پندرہ بیس روز میں واپس آجائے گا۔ مگر کچھ ایسی ٹیکنیکل دشواریاں پیش آئیں جنہیں دور کرنے کے لیے نمن کو لندن میں دو ہفتے کی بجائے چار ہفتے رہنا پڑا۔ اور پھر ان ہی ٹیکنیکل مسئلوں کو سلجھانے کے لیے اُسے لندن سے پیرس اور پیرس سے روم جانا پڑا۔ اور معاملہ ٹلتا گیا۔

شوٹنگ روک دینے سے پریم بالا بہت بور ہونے لگی تھی۔ ایک دن اس نے مجھے مشورہ دیا۔ "تم شوٹنگ کیوں روک بیٹھے ہو۔ آخر ایک دن پرنٹ یورپ سے بن کر آ ہی جائیں گے۔ ایک دن تمہیں ڈسٹری بیوٹروں کے چھ لاکھ کے چیک بھی مل جائیں گے۔ مگر تم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہو؟ وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟ ہمت سے کام لے کر شوٹنگ شروع کر دو۔ تمہارے پاس پیسہ نہ ہو تو مجھ سے دو، چار، دس لاکھ لے لو۔"

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا اور اسی وقت کام شروع کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

ہم نے نمن کو روم میں روک دیا تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ دس دن کی شوٹنگ اور ہو جائے تو اس کے پرنٹ بھی بنوانے کے لیے یورپ بھیج دیں۔ بدقسمتی سے پہلے دس دن کے پرنٹ خراب نکلے۔ اس لیے دس دن تک مزید شوٹنگ کرنی پڑی۔ اس دوران میں سب لوگوں نے تقاضے شروع کر دیئے، اور ہمیں وعدے کے مطابق سب کو روپے دینے پڑے۔ پھر ایک روز اشوک کمار کا کسی بات پہ پریم بالا سے جھگڑا ہو گیا۔ میں نے غصے میں آکر اشوک کمار کا چلتا کر دیا۔ اور اس کی جگہ روپ کمار کو لے کر مزید بیس روز کی شوٹنگ کی۔ سات لاکھ اس میں نکل گئے۔
غرضیکہ اگلے سات مہینوں میں پورا پتڑا ہو گیا۔ تیس کا تیس لاکھ پکچر میں گل گیا۔ اور پکچر

ابھی نامکمل تھی۔ ڈسٹری بیوٹروں سے ایک دھیلا وصول نہ ہوا تھا، اور سمن اب نیویارک میں تھا۔
میں نے سیٹھ بھسوڑی مل سے روپے مانگے۔ اس نے کورا جواب دے دیا بولا۔ "میرے خیال میں، گوروجی! آپ کو فلم کا کام راس نہیں آیا۔ میرے خیال میں تو اب آپ کو سیدھا ہمالیہ چلا جانا چاہیے۔"

میں نے دادا دھمال سے بات کی تو وہ بولا۔ "سیٹھ، کیا بتاؤں کس قدر شرمندہ ہوں۔ جانے کیسی گھڑی تھی وہ منحوس جب ہم نے یہ پکچر شروع کی تھی لے دے کے میرے پاس ایک چھکڑا گاڑی ہے، چاہو تو اُسے لے لو۔ پانچ سات سو میں تو بک ہی جائے گی۔"

"پانچ سات سو سے کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "میں نے اپنی سی پوری کوشش کر ڈالی۔ اتنا عرصہ کسی دوسری جگہ اگر کام کیا ہوتا تو اب تک شاید دو پکچریں ختم کر ڈالتا۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے سیٹھ، اگر تم کہیں سے تین لاکھ کا بندوبست کر دو تو میں تین لاکھ میں ہی پکچر ختم کر دوں گا۔ پکا وعدہ کرتا ہوں۔ تین لاکھ کے بعد سارا پیسہ ڈسٹری بیوٹر سے آجائے گا ——— اور اپنی جیب سے ایک دھیلا نہیں جائے گا۔"

مگر تین لاکھ روپے کون دے گا۔؟

دو تین دن میں اسی پریشانی میں گھومتا رہا، اور سوچتا رہا آخر ایک شام میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے پریما [illegible] تین لاکھ کا قرض مانگنا چاہیے۔ دیکھا جائے تو میرے روپے اس پر واجب بھی ہیں۔ اپنے کانٹریکٹ کی رقم کے علاوہ وہ مجھ سے دو لاکھ قرض لے چکی ہے۔ وہ دو لاکھ اگر واپس کر دے اور ایک لاکھ مجھے [illegible] دے تو میرا بیڑا پار ہو سکتا ہے۔

یہی سوچ کر ایک دن شام کو ہمت کر کے میں اس کے بنگلے پہنچ [illegible] ڈرائنگ روم کے اندر [illegible] ہی مجھے دھچکا سا لگا۔ [illegible] نے دیکھ کر وہ اشوک کمار کے گود میں بیٹھی ڈرنک کر رہی

ہے۔ وہی اشونی کمار جسے میں نے پریم بالا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پکچر سے نکال دیا تھا۔ اور اس کا سارا حساب چکتا کر دیا تھا۔ اس وقت وہ اسی اشونی کمار کی آغوش میں بیٹھی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ذرا تیز ہو کر بولی۔ "کیا ہے؟ کیا ہے؟ ایسے بن بلائے، مونہہ اٹھائے اندر کیوں چلے آئے؟"

میں نے کہا۔ "میں اس وقت ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ اس پکچر میں میرے بتّیس لاکھ روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ اب اگر تین لاکھ تم دے دو تو میری پکچر مکمل ہو سکتی ہے۔"

"تین لاکھ میں دے دوں؟" وہ زور سے چلائی اور میرے قریب آکر بولی۔ "تم پاگل تو نہیں ہو؟"

"پاگل تو نہیں تھا مگر بنایا گیا ہوں۔ میں تم سے کچھ زیادہ تو مانگ نہیں رہا ہوں۔ دو لاکھ کا قرض تو تم پر واجب ہی ہے۔"

"کیسا دو لاکھ کا قرض؟" وہ پھر زور سے چیخی۔

"ڈیڑھ لاکھ تو تم نے انکم ٹیکس ادا کرنے کے سلسلے میں لیا تھا اور پچاس ہزار ایک نئی گاڑی خریدنے کے لیے لیا تھا۔ یاد آیا ڈارلنگ؟"

"ڈارلنگ؟ میں کسی کی ڈارلنگ نہیں ہوں؟" پریم بالا لپک کر بولی۔ "تم نے سُنا اشونی! یہ گدھا مجھے ڈارلنگ کہتا ہے۔"

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "کل تک جب تک میری جیب میں تیس لاکھ روپیہ تھا، میں سیٹھ تھا۔ آج میں ایک گدھا ہوں۔"

"گیٹ آوٹ یو ڈرٹی ڈنکی ...." وہ دونوں ہاتھوں سے مجھے طمانچے مارنے لگی۔

مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے کہا۔ "بس پریم بالا ہوش میں آؤ ــــ میں بھی اب یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔ اور جاؤں گا تو اسی وقت جاؤں گا جب آپ میرا روپیہ لوٹا دیں گی۔"

"تو نہیں جائے گا؟" وہ بولی۔
"نہیں۔"

"نہیں" میں نے مضبوطی سے جواب دیا۔
پریم بالا نے ایک چھڑی اٹھالی اور اشوئی سے بولی۔
"اشوئی، تم ڈرائنگ روم کا دروازہ تو ذرا اندر سے بند کر دو اور دوسری چھڑی بھی اٹھالو...."

پونا جانے والی لمبی، اکیلی اور اداس سڑک پر ایک گدھا چلا جا رہا تھا۔
اس نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک بیل مرا پڑا ہے۔ اور اس کے سرہانے دو انسان، ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں۔
"کیا ہوا؟" گدھے نے رُک کر پوچھا۔
"ہمارا بیل مر گیا" مرد نے غم سے سسکتے ہوئے کہا۔
"تو دوسرا بیل خرید لو" گدھے نے مشورہ دیا۔
"کوئی دوسرا بیل اس بیل کی جگہ نہیں لے سکتا۔ ہم نے اسے بڑی مشکل سے سدھایا تھا۔ ہم اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے تھے اور کسانوں کا مجمع اکٹھا کر کے اس بیل کی مدد سے ان لوگوں کی قسمت کا حال بتاتے تھے" عورت نے روتے ہوئے اپنی بپتا کہہ سنائی۔
گدھے نے کہا۔ "وہ زمانے لد گئے جب اندھے کسانوں کو ان کی قسمت کا حال بتاتے تھے۔ اور غریب کسان ایک اندھے بیل کی طرح اپنی قسمت کے کولہو کے گرد گھومتے جاتے تھے۔ یہ زمانہ آنکھیں کھول کر کام کرنے کا ہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے لو اور اپنے کسان دوستوں میں لے چلو۔ میں انہیں اخبار پڑھ کر سناؤں گا اور زندگی کی نئی تقدیر کی راہ

دکھاؤں گا جو سٹے سے نہیں بلکہ سچی محنت سے پیدا ہوتی ہے۔

دھرتی وشال تھی۔ آسمان بے کنار تھا۔ اور اب وہ تینوں ساتھ چل رہے تھے۔ ایک مرد، ایک گدھا، ایک عورت۔ مرد جو خالق ہے، عورت جو ماں ہے، گدھا جو زندگی کی محنت اور اس کی معصومیت ہے۔

ختم شد

مکرمی آداب!

ایشیا پبلیشرز دہلی اردو کی خدمت پچھلے چالیس سال سے کر رہا ہے۔ اس سال ہم نے پانچ کتابیں شائع کی ہیں ان کتابوں کا بڑھیا گیٹ اپ، بڑھیا کاغذ، کتابت اور طباعت آفسیٹ پر کرائی ہے۔ سائز 16 = 23×36

۱۔ گدھے کی واپسی	از۔ کرشن چندر	قیمت =/75
۲۔ شہزادہ	از۔ کرشن چندر	قیمت =/130
۳۔ ہوائی قلعے	از۔ کرشن چندر	قیمت =/120
۴۔ کبوتر کے خط	از کرشن چندر	قیمت =/120
۵۔ ایک گرجا، ایک خندق	از۔ کرشن چندر	قیمت =/130

ہماری دیگر کتب جو اب تک شائع ہوئی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

کتاب	مصنف	قیمت
محبت بھی قیامت بھی	کرشن چندر	=/80
مسرت	"	=/60
اَن داتا	"	=/35
شکست	"	=/100
زندگی کے موڑ پر	"	=/35
گلشن گلشن ڈھونڈا تجھ کو	"	=/30
الٹا درخت	"	=/35
مگڑی	"	=/60
میری یادوں کے چنار	کرشن چندر	=/75
ٹوٹے ہوئے تارے	"	=/60
گیہوں اور گلاب	خواجہ احمد عباس	=/70
کرشن چندر شخصیت اور فن	جگدیش چندر ودھاون	=/250
منٹو نامہ	"	
عصمت چغتائی شخصیت اور فن	"	=/250

آپ کے آرڈر کا انتظار رہے گا۔
خاکسار منیجر ایشیا پبلیشرز

ایشیا پبلیشرز

اے 36۔ چیتک اپارٹمنٹس پلاٹ نمبر 27/2۔ سیکٹر 9
روہنی دہلی 85

M/s Asia Publishers
A-36 Chetak Appt.,
Plot No:27/2
Sector 9 Rohini,
Delhi-85
T.NO:7261823

گدھے کی واپسی میں ملکی سیاست - انتظامیہ - دفتری نظام - سربرآوردہ طبقہ - اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں - سیٹھوں - اخبار نویسوں ، ادیبوں کی صدارتِ حال کا خاکہ پیش کیا گیا ہے -

سیاستدانوں کی ریشہ دوانیوں ، ظاہرداریوں اور عیاریوں کے نقش طنزیہ پیرائے میں اجاگر کئے گئے ہیں - سیاستدانوں کی ریشہ دوانیوں اور شعبدے بازیوں اور سرکاری محکموں کے ناکارہ پن اور نااہلی کے پس منظر میں ہندوستان کے پس ماندہ اور ناخواندہ عوام کی مظلومیت بے دست پائی اور نارسائی بڑے موثر انداز میں کی گئی ہے -

" دھرتی وشال تھی - آسمان بے کنار تھا - اب وہ تینوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے - ایک مرد - ایک عورت - مرد جو خالق ہے - عورت جو ماں ہے - گدھا جو زندگی محنت اور اس کی معصومیت ہے "

ASIA PUBLISHERS